پودے

کرشن چندر

مکتبۂ سلطانی بمبئی

پہلا ایڈیشن ..... دو ہزار ۱۹۴۷ء

قیمت: دو روپیہ

ناشر

مکتبۂ سلطانی
ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳

پرنٹر پبلشر سلطان حسین مالک سلطانی فائن آرٹ لیتھو اینڈ پرنٹنگ پریس بمبئی ۳ سے شائع کیا

شیخ محمد عبداللہ صاحب شیرِ کشمیر کے نام

فہرست

خطبہ صدارت

ب

خطبۂ صدارت

کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس حیدر آباد دکن اکتوبر ۱۹۴۵ء

ترقی پسند ادیبوں کی یہ کانفرنس ایک نہایت نازک مرحلہ پر آئی ہے
جنگ ختم ہو چکی ہے۔ اور زمانہ مابعد جنگ کے تمام دقیق مسائل الجھے پڑے ہیں میں
اس موقع پر اس بنیادی سوال سے بحث نہیں کروں گا کہ ایک ادیب کو ان
مسائل کو سلجھانے سے کیا حاصل یا اسے اس قسم کے جھگڑوں سے کیا سروکار چونکہ یہ کانفرنس
اپنے ساتھیوں کے لئے ہے اس لئے میں اپنے لئے اور آپ کے لئے بھی ترقی پسند ادب
کی تمام مبادیات کو قبول کئے لیتا ہوں۔ یہ کہ ادب کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اور جب زندگی
اور اس کے شواہد و عوامل بدلتے ہیں تو ادب بھی بدلتا ہے یہ کہ ادب اور سیاست
الگ نہیں ہو سکتے۔ یہ کہ ہر ادب مقصدی اور افادی ہوتا ہے وہ کس مقصد کے
لیے لکھا جاتا ہے اور اس کا فائدہ کن جماعتوں کو پہنچتا ہے۔ ہر ادیب کی ذہنی
افتاد طبع اور اس کے جماعتی رجحان پر منحصر ہے۔ یہ کہ جس طرح اقتصادی اور سماجی
اور معاشی ادارے نظام زندگی میں بنیادی اختلافات پیدا کرتے ہیں اسی طرح
وہ ادب پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور مختلف ادبی جماعتوں کو وجود میں
لاتے ہیں۔ وہ جماعتیں جو ادب میں ایسی زبان استعمال کرتی ہیں جو عوام سے
کوسوں دور ہے وہ جماعتیں جاگیردارانہ نظام زندگی کے بچے کھچے عناصر کے کیف و

ج

ونشاط کے لئے آراستہ ہیں۔ وہ جماعتیں جو ہر منزل پر سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے ساتھ رہتی ہیں اور پھر وہ جماعتیں جن کی نگاہ ماضی اور حال اور مستقبل کو ایک ہی لڑی میں پروئی ہوئی ہے یہ نگاہ تاریخ کا مطالعہ کرتی ہوئی انسانوں میں ایک نئی تمدنی تہذیبی، سیاسی اور معاشی اشتراک کی داغ بیل ڈال رہی ہے ہمارے ادب میں یہ تمام جماعتیں مصروفِ کار نظر آتی ہیں اور ادیبوں کے مختلف گروہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان جماعتوں میں سے کسی ایک نہ ایک جماعت سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ موخر الذکر جماعت ترقی پسند ادیبوں کی ہے اور ہم لوگ اس لئے یہاں اکٹھا ہوئے ہیں کہ اپنے گردوپیش کے حالات پر نظر ڈالیں اور اسکی روشنی میں اپنے لئے ایک صحیح لائحہ عمل مرتب کریں۔

پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے نتائج میں جو نمایاں فرق مجھے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس جنگ کے خاتمہ پر ہم اپنے جمہوری مقاصد کے زیادہ قریب آگئے ہیں پورے ایشیا میں آزادی کی روح نغمہ لحنواں نظر آتی ہے۔

ایشیائی روس کے ادیبوں کے افکار میں اس بادۂ آہنگ کی گونج سنائی دیتی ہے جب قوم آزاد ہو جاتی ہے جب اسکے تہذیبی افق پر سے غلامی کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ جب اس کا مذہب غیروں کی ریشہ دوانیوں سے رہائی حاصل کر لیتا ہے اور جب اس کا سماج باہمی اشتراک کے اصولوں پر کاربند ہو کر ایک غیور خودی سے سرشار ایک بلند و بالا مستقبل کی طرف بے کھٹکے بڑھتا ہے سوویٹ ایشیا کے ادیبوں کے نغمے پہاڑی جھرنوں کے چہچہے میں وہ اپنے مستقبل کو ایسی طمانیت سے دیکھتے ہیں جو ابھی ہماری نگاہوں کو میسر نہیں۔ ہمیں ابھی اپنے سوئے ہوئے مرغزاروں کو جگانا ہے اسکی خوابناک وادیوں کو گونجانا ہے۔ اپنے خزاں رسیدہ چمن میں اس بہار کو تازہ کرنا ہے جسکی کلیاں ہمارے دلوں میں پھوٹ رہی ہیں، اور جس کا سنگیت ہماری روحوں میں نغمہ ریز ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا پورے

ایشیا میں آزادی کی لہر جاری و ساری ہے۔ ایشیا ہی میں نہیں افریقہ میں بھی
عربستان اور ایشیائے کوچک کا علاقہ اور خطۂ بحرِ روم کے عرب علاقہ اور شام و
لبنان میں یہ تحریک زور پکڑ چکی ہے۔ وہاں کے نئے ادیبوں کے افکار میں اور
صحافیوں کی تحریروں میں یہی رنگ غالب ہے، یہی آواز ہر جگہ سے بلند ہو رہی ہے،
نعرۂ آزادی، حقِ خود ارادیت اور مغربی استعماریت سے نجات اور دیوارِ رنگ و
نسل و خون کے خلاف ایک شدید احتجاج یہ مغربی افریقہ کے بیشتر ادیب ہیں
ان کی تحریروں میں بھی آپ کو آزادی کے متعلق اسی تجسس اور بیقراری کا
پتہ چلتا ہے۔ زنجیروں کو توڑ دینے کی آرزو ہے۔ خود نئے ایرانی ادیبوں
خصوصاً آذربائیجان کے علاقے کے ادیبوں میں جو اشتراکی فلسفہ سے زیادہ
متاثر ہوئے ہیں۔ ساقی و مینا و جام کا بہت کم ذکر ہے اسلئے کہ جب ساقی قحط سالی
سے مر جائے اور شراب میں زہر ملا دیا جائے اور جام ہاتھ سے چھین جائے تو نغمے
کی نوعیت بدل جاتی ہے، جی چاہتا ہے بہار پھر آجائے۔ شہد آگیں ہونٹ پھر
مسکرانے لگیں۔ اور آنکھوں میں ہنسی کے کنول کھلنے لگیں لیکن جب ادیب دیکھتا
ہے کہ یہ بہار سامنتی ادب میں ممکن نہیں تو وہ اشتراکی ادب کی تخلیق پر مجبور ہو جاتا
ہے۔ اس نظامِ زندگی کی تخلیق پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس نظامِ زندگی کی تخلیق پر
جہاں ٹراکٹروں کی کاوش سے زمین سونا اگلتی ہے اور تمام بڑے کارخانے مزدوروں
اور کسانوں کی باہمی اشتراک سے چلتے ہیں اور ملک کا ہر فرد اپنے مستقبل کو
اپنے ہاتھوں میں محفوظ سمجھتا ہے۔

پچھلی جنگ میں ایسا نہیں ہوا تھا کم از کم اس حد تک جنتا کی لڑائی آگے
نہیں بڑھی تھی۔ اس وقت مختلف استعماری قوتوں کی ٹکر تھی۔ ایسی قومیں جن میں
سے چند ایک مخالف جماعتوں کے مقابلے پر زیادہ ترقی پسند جمہوری اداروں
کی حامل تھیں۔ پھر بھی گزشتہ جنگ نے انقلابِ روس کو جنم دیا اور اشتراکی فلسفے کو

فلسفے کی حدود سے نکال کر عمل کا جامہ پہنایا۔ اور ادھر استعماری علاقوں میں انقلابی قوتوں کو مضبوط کیا اور نو آبادیات کے باشندوں میں آزادی اور اس سے متعلق خیالات کی ترویج کی لیکن اس جنگ میں جنتا کی لڑائی اور آگے بڑھی ہے۔ اب کے مقابلہ صرف استعماری قوتوں میں نہ تھا۔ اب کے مقابلہ اشتراکیت اور فاشیت میں تھا۔ برطانیہ اور امریکہ کی نیم استعماری نیم جمہوری حکومتوں نے بھی حق آزادیت اور "چار آزادیوں" یعنی "فور فریڈمس" کے نام پر یہ لڑائی لڑی ہے اور اپنے ملکی عوام کے سامنے بار بار انہیں خیالات کی اشاعت کی تاریخ نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ فاشیت کے مقابلہ میں اشتراکیت کا ساتھ دیں اور اس طرح سے خود ہی استعماریت اپنے ہاتھوں استعماریت کے ہاتھ کمزور کرے چنانچہ اس جنگ میں جہاں فاشیت کو مکمل شکست ہوئی ہے وہاں استعماریت کی مستحکم دیواریں بھی ہل گئی ہیں۔ ہندوستان سے لیکر ماچوریا تک اور آزادی کے جذبے کی پشت پناہی کے لئے دنیا بھر کی ترقی پسند جماعتوں کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ اس میں دیوار رنگ و نسل کی تفریق بھی نہیں ہے۔ اگر انڈونیشیا میں حریت کا نعرہ بلند ہوتا ہے تو فرانس کی تحریک مقاومت اور وہاں کے ادیب اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اگر جاوا میں ایشیائی آزادی چاہتے ہیں تو آسٹریلیا کے ہزاروں گورے مزدوران اسلحہ جات کو جہازوں میں بھرنے کے لئے انکار کر دیتے ہیں جو نا ترقی پسند جماعتوں کی طرف سے اس تحریک کو کچلنے کے لئے جاوا میں بھیجے جا رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ایشیا میں اور امریکہ میں جنتا کی لڑائی کو اور بھی تقویت پہنچانی چاہئے اور اس RESISTANCE MOVEMENT کا جو مراکش سے لیکر ہند چینی تک ایک آگ کی طرح پھیلتی جا رہی ہے خیر مقدم کرنا چاہئے۔ اسے اپنی تحریروں میں ایک نمایاں جگہ دینا چاہئے تاکہ نو آبادیات کا غریب انسان دبا ہوا، کچلا ہوا انسان ایک ہمت

رجعت پسندی کا مجنونانہ رقص پہلے سے بھی زیادہ ہلاکت خیزی لئے ہوئے ہے
پہلے اگر انگریزی سامراج محبان وطن کو پھانسی کے تختوں پر لٹکا کر نہتوں پر
گولیاں چلا کر اور بے گناہوں کو گرفتار کر کے آزادی کی تحریک کو دبانے کی کوشش
کرتا تھا تو آج ہندوستانی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں اور نفع خوروں کے دو
متضاد گروہوں کی آڑ لیکر اور اپنے مکروہ چہرے پر نقاب ڈالکر وہ ملک میں
خانہ جنگی کی آگ بھڑکاتا ہے تاکہ انقلابی عوام متحد ہو کر اس سے لڑنے کے بجائے آپس
میں دست وگریباں ہو جائیں اور اس طرح سامراجی طاقت اور ہندوستانی رجعت
پسند مفاد فنا ہونے سے بچ جائیں۔

سیاسی محاذ پر اگر خانہ جنگی کے حربے سے انگریز بھی شکست دینا چاہتے ہیں۔
تو تہذیبی اور ادبی محاذ بھی اُن کے اور ان کے ساتھ مل جانے والے ہندو اور مسلمان
فرقہ پرست امیروں کے خطرناک حملوں سے محفوظ نہیں ہے۔ ترقی پسندوں کی
تحریک کے لئے سب سے زیادہ تشویشناک امر یہ ہے کہ پڑھے لکھے درمیانی طبقے میں
فرقہ پرستی کا زہر تیزی سے پھیل رہا ہے اور بہت سے وہ لوگ بھی جو اپنے آپکو آزادی
خواہ سمجھتے ہیں۔ انگریزوں سے پہلے اپنے ہم وطنوں سے لڑنا زیادہ ضروری سمجھتے
ہیں۔ سیاسی حقیقت بینی کے فقدان کے ساتھ ساتھ معمولی انسانیت اور معمولی شرافت
تک کو بھلا دینا ان لوگوں میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فضا میں جہاں
انسانیت کی بنیادی قدروں اور ابتدائی مفروضات کو پیروں سے کچلا جائے۔
ترقی پسند ادیبوں کا کام بہت دشوار ہو جائے گا۔ اور انہیں کافی مشکلوں کا سامنا
کرنا پڑے گا۔ لیکن سستی مقبولیت کے لئے ہم نے کبھی اپنے اصولوں کو ترک نہیں کیا

آج تو اسکی اور ضرورت ہے کہ مسلمان اور ہندو فرقہ پرستی کے اس طوفان میں ہم انسانیت کے اس ہمہ گیر نصب العین کو جو مذہب اور فرقوں کی تفریق کو بیکار اور نقصان دہ سمجھ کر عالمگیر انسانیت کی برادری اور مساوات ہر قوم کی آزادی اور اشتراکیت کے اصول کو اپناتا ہے جو ملک کی خانہ جنگی کو انگریزی سامراجیوں اور ہندوستانی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی ایک نحس سازش تصور کرتا ہے اور جو ہر مذہب و ملت اور فرقے کے محنت کش عوام اور درمیانی طبقے کے باہمی انقلابی اتحاد کو ہندوستان کی انقلابی جد و جہد کی کامیابی اور مستقبل کی معاشرت کی کنجی سمجھتا ہے۔ اپنی ادبی تخلیقوں میں زیادہ سے زیادہ اور مختلف پہلوؤں سے پیش کریں۔ میری رائے میں اسوقت ہندوستانی ادیبوں سے ترقی پسندی کا یہی سب سے اہم تقاضہ ہے۔ جو شخص بھی بودے، بڑھے گا وہ ہم سے اسکی توقع کریگا اور مجھے تو اس کا یقین ہے کہ جیسے اور بہت سے مراحل ترقی پسند کام نے طے کئے اسی طرح اس موقع پر بھی ان کی قلم اور انکی زبانیں حرکت میں آئینگی۔ اور یہی ترقی پسند کام کے ارتقار کی ضمانت ہے۔

(سید) سجاد ظہیر

بمبئی - نومبر ۱۹۴۶ء

پیش لفظ

کیسی سخت ہوگی وہ زمین جہاں دس سال کی مسلسل عرق ریزی کے بعد پودے اُگیں۔ اور کیسا سخت جان ہوگا وہ بیج جس نے دس سال تک مٹی، دھول اور کیچڑ میں اٹ پٹ ہونے کے باوجود ارتقا کی طاقت ضایع نہ ہونے دی۔ یہاں تک کہ اس کا سینہ چاک ہوا اور اس میں سے نئی زندگی کی نرم و نازک و ریشمیں سبز کونپلیں پھوٹ پڑیں

ترقی پسند ادب کی تحریک کو شروع ہوئے دس سال ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۶ء تک۔ اور آج ہم ان پودوں پر نظر ڈال سکتے ہیں جن کی تصویر کرشن چندر نے اپنے دلگداز ارتعاش اور لطیف احساس کے ساتھ کھینچی ہے۔ یہاں اس تصویر میں شخصیتیں فروعی ہیں۔ ان کے افعال دلچسپ طرح سے پیش کئے جانے کے باوجود معمولی ہیں۔ ان کی صورتیں وہ تو معمولی سے بھی کچھ کم ہیں اور ان کے کردار خطا و نسیان کے مرکب ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کسی آتشیں تصور سے یہ ساری محفل گرم ہے کسی اجتماعی جذبے کی حرارت نے اس میں سوز و ساز بھر دیا ہے۔ اور کسی شرربار وجدان نے ساری فضا میں سرخ کپکپاہٹ پیدا کر دی ہے۔

ترقی پسند کا لفظ کس قدر سپاٹ، کتنا غیر شاعرانہ، کتنا ٹھنڈا ہے اور اُس مفہوم کے لئے کتنا ناموزوں، جو اس سے وابستہ ہو گیا ہے۔ مگر اس دس سال میں وہ تصور جو اس لفظ سے وابستہ ہے، ایک انجمن، اور انجمن ایک تحریک کی شکل آخر کیسے اور کیوں اختیار کر گئے؟

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں۔ جب دو تین نوجوان ایک اعلان نامہ کا مسودہ لئے ادھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے پریم چند، جوش اور عبد الحق نے دستخط کئے تو ہم سمجھے کہ بہت بڑی کامیابی ہوئی۔ اسکے بعد جب لکھنؤ میں ہماری پہلی کانفرنس ہوئی رفاہ عام ہال میں بڑی مشکل سے ہم نے دو ڈھائی سو روپے جمع کئے تھے رات بھر سارے شہر کی دیواروں پر کانفرنس کے اشتہار چپاں کئے تھے اور تھکے ہارے کانفرنس کے ہال میں صبح سویرے سے ہی پہنچ گئے تھے کہ شاید ایسا نہ ہو پندرہ بیس آدمیوں سے زیادہ اس میں شریک بھی نہ ہوں۔ گھنٹے دو گھنٹے ٹکٹ سے داخلہ کا اصول جاری رکھنے کے بعد کانفرنس میں شرکت عام کی اجازت دیدی تھی تاکہ کم از کم غریب طالب علم تو شریک ہو جائے۔ سارے ہندوستان سے کل پندرہ بیس ڈیلی گیٹ آئے تھے کافی گھبرائے ہوئے اور پریشان تھے ہم اِن لوگوں! بہت چھوٹا سا ڈائس تھا۔ اور صدر کی میز اور کرسی پرانی اور بوسیدہ تھی۔ دو ہی کرسیاں اوپر تھیں ایک پر پریم چند بیٹھے تھا اور دوسری پر حسرت موہانی۔ رفتہ رفتہ ہال بھر گیا۔ کوئی ڈیڑھ دو سو آدمی ہوں گے جن میں سے زیادہ تر ادیب نہ تھے۔ جبھی تو لوگوں نے فقرے کسے کہ یہ لوگ ترقی پسند زیادہ ہیں اور مصنف کم۔ مگر اس اعتراض میں سچائی تھی اور جب کبھی ہم کسیکو یہ کہتے ہوئے سنتے تو ہمارے سینے میں ایک نیزہ سا لگتا تھا۔ لیکن سچائی کا ایک اور پہلو بھی تھا جسے یہ

لوگ نہیں سمجھتے تھے۔ اور جس سے ہم اب دس برس کے بڑے تلخ تجربوں سے گذرنے کے بعد کسی قدر واقف ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ترقی پسند ہونا، اپنی سمجھ اور شعور کو ترقی پسند بنانا اور اپنے کردار میں ترقی پسندی پیدا کرنا، یعنی اپنی ذات کو بدلنا اور برابر بدلتے رہنا۔ تاکہ ہم ایک ترقی پسند انسان بن سکیں یہ عمل زیادہ اہم زیادہ ضروری اور زیادہ مشکل ہے۔ اور بغیر ترقی پسند انسان بنے ہوئے کسی کا ترقی پسند مصنف ہونا بہت دشوار بلکہ میں کہوں گا کہ ناممکن ہے ہم اپنی ناسمجھی میں دستخطوں اور مجمعوں اور بڑے آدمیوں کی حمایت کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ حالانکہ ہمارا سب سے قیمتی سرمایہ ہمارا وہ نصب العین تھا جسے ہم نے اپنے منشور میں متعین کیا تھا جس کی اہمیت اس وجہ سے نہیں تھی کہ اس پر بعض لوگوں نے دستخط کر دئے تھے بلکہ اس وجہ سے تھی کہ وہ ایک نئے شعور اور ایک زندہ صداقت کا حامل تھا۔ اس میں وہ نیا جذبہ اور نیا ارادہ جھلک رہا تھا جو صرف ہندوستان کے لوگوں کو ہی نہیں ساری دنیا کے محنت کش عوام اور دیانت دار اہل علم اور دانش وروں کو متحرک کر رہا تھا۔ ہم نے کہا کہ

> "ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک افلاس۔ سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔
>
> ہم اُن تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جا رہے ہیں۔
>
> ہم اُن تمام باتوں کو جو ہماری قوتِ تنقید کو اُبھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں۔ تغیر اور

ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں،،
(ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ)

ترقی پسندوں کی یہ خواہش اور ان کا یہ مقصد ہوائی نہ تھا۔ یہ ہماری معاشرت اور زندگی کے تقاضے تھے جو ترقی پسندوں کی زبان سے ادا ہو رہے تھے۔ یہی سبب ہے کہ آزادی وطن اور اشتراکیت کی جد و جہد کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک ترقی پسند ادب کی تحریک تیزی سے پھیل گئی۔ اور اپنی تنظیمی خامیوں کے باوجود ہندوستان کی بڑی بڑی زبانوں کے سب سے زیادہ ہونہار لکھنے والے اس تحریک کے احاطے میں آ گئے۔ مزید براں ہمارے ملک کے اکثر مستند اور مشہور ادیب بھی اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔

حیدر آباد (دکن) میں گزشتہ سال (دسمبر ۱۹۴۵ء) اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کل ہند کانفرنس ہوئی جسکی بنیاد پر کرشن چندر نے پودے لکھا ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ کانفرنس ہماری تحریک کے ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے ادبی تخلیق کے ابتدائی مراحل سے گذرنے کے لئے ہم نے نو دس سال لگائے ہماری تحریک نے جڑ پکڑ لی ہے۔ اب ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ یہ پودے بڑھیں بڑھکر مضبوط اور تناور پیڑ بنیں، پھلیں اور پھولیں۔ اگر ہم میں کوئی شخص ایسا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اس نئے دور میں ہمارا کام پہلے کے مقابلے میں سہل ہے تو وہ سخت غلطی کر رہا ہے۔ اس لیئے کہ وہ "بنیادی مسائل" جن کا ہم نے دس سال پہلے اپنے اعلان نامے میں ذکر کیا تھا۔ اگر انقلاب کی قوتوں کے زیادہ مضبوط ہونے کے باعث حل ہونے کے زیادہ قریب ہیں۔ تو ساتھ ہی ساتھ انقلابی بحران میں گرفتار

بخش توانا اور شاداب فضا میں سانس لے سکے۔

ہندوستان میں عوامی تحریکوں کی دھڑکنیں تیز تر ہو گئی ہیں کانگریس، مسلم لیگ، اور کمیونسٹ پارٹی ان تینوں عوامی جماعتوں نے جنگ کے دوران میں اپنے حلقۂ اثر کو مضبوط کیا ہے اور اپنے حلقۂ اقتدار کو پھیلایا ہے۔ یہ تینوں جماعتیں ملک کے ہر گوشے میں پھیلی ہوئی ہیں اور گو سیاسی پلیٹ فارم پر انکی یک جہتی کے آثار ابھی نمایاں نہیں ہیں تاہم مقام شکر ہے کہ ادبی محاذ پر تینوں جماعتیں ہمارے ترقی پسند گروہ میں شیر و شکر کی طرح گھلی ہوئی ہیں۔ ترقی پسند مصنفین میں بیشتر اصحاب ایسے ہیں جو کانگریس، مسلم لیگ یا کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور اگر نہیں رکھتے ہیں جب بھی وہ اپنے خیالات میں اور اعتقادات میں ان ہی میں سے کسی ایک نہ ایک عوامی جماعت سے ضرور متاثر ہیں لیکن ان مخالفت اور بظاہر متضاد رجحانات کے باوجود ان کے بالغ اذہان میں اس مستقبل کی ترتیب و توازن کا خاکہ ضرور موجود ہے جو ان تینوں جماعتوں کی یک جہتی کے سوا شرمندۂ تکمیل نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک کے ادبی اور سیاسی مستقبل کے لئے یہ برادرانہ یک جہتی جو ترقی پسند مصنفین میں پائی جاتی ہے ایک نیک فال ہے۔ ہمیں ہر نہج سے اور ہر صورت سے اس یک جہتی کی تائید کرنا چاہیئے۔ عین ممکن ہے کہ وہ کام جو آج ہمارے ملک کے نوجوان ادیب کر رہے ہیں ہمارے بڑے بزرگوں کی سمجھ میں بھی آجائے یا خود ہمارا کام انہیں اس بات کے لئے مجبور کر دے کہ وہ پھر ایک ہو جائیں اور ملک کی آزادی اور حق خود ارادیت کے لئے کام کرنا شروع کر دیں تاکہ ہماری قومیں ایشائی قوموں کی برادری میں اور پھر پوری دنیا کی قوموں کی برادری میں اپنی صحیح جگہ لے سکیں۔ اس وقت ملک کی فضا شاید اس کام کے لئے زیادہ سازگار نہیں ہے۔ شاید انتخابات کی سرگرمی میں اس وقت منافقت اور الگ

جھتے بندی پر زور دیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ امر کم از کم میرے لئے تو اس قدر واضح اور روشن ہے کہ میں اسے دہرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کچھ بھی ہو عوامی جماعتوں میں لڑائی کتنی شدید کیوں نہ ہو جائے ہمیں اپنا دماغی توازن نہ کھونا چاہیے۔ اور اس بات کو ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ ایک دن فیصلہ ہو گا ایک دن اتحاد ہو گا ایک دن ہندوستان کی جمہوری اور عوامی تحریکوں کو اپنے مقصد اعلیٰ اپنے نصب العین کے حصول کی خاطر متّحدہ محاذ بنانا پڑے گا۔ اس دن کو قریب لانے کے لئے، اس نصب العین کی خاطر اس محاذ کی تخلیق کے لئے اور پھر اس اشتراک کی ترقی کے لئے جو آج ہمارے پلیٹ فارم پر ایک واضح عملی صورت میں جلوہ گر ہے ہمیں اپنی ساری ادبی کاوشوں اور صلاحیتوں سے کام لینا چاہیے۔ اس لئے عوام کی بہتری پر عمومی جماعت کا فرض اولین ہے اور موجودہ دور میں اس ملک کے ادیبوں کے لئے بھی اس سے بہتر تخلیقی کارنامہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی کاوشوں سے اس دن کو قریب لے آئیں جب یہاں کے چالیس کروڑ انسانوں کے لئے ایک صورت حال کو وجود میں لانا اشد ضروری ہے۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ میں تو ادب کی وقتی اضافی اور ہنگامی قدروں سے بحث کر رہا ہوں۔ ادب کی کچھ دوامی ابدی قدریں بھی ہوتی ہیں ان کے متعلق ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اول تو یہ مجھے معلوم نہیں کہ ادب کی ابدی قدریں کیا ہیں۔ میں صرف ایک ابدی قدر سے واقف ہوں اور وہ ہے تغیر، ارتقاء انسان کی سماجی زندگی میں تغیر مجھے اسکے ارتقاء کی ایک لازمی قدر معلوم ہوتی ہے۔ اور یہی ایک دوامی قدر ایسی ہے جس کا وجود میں تسلیم کر سکتا ہوں باقی جتنی بھی قدریں ہیں وہ انسان کے حواس خمسہ اور اس کے احساسات کے دائرے میں رہ کر بدلتی رہتی ہے۔ اور اسلئے دوامی نہیں۔ اضافی۔ وقتی۔ اور ہنگامی ہیں۔ کچھ لوگ عشق کو ایک دوامی قدر سمجھتے ہیں لیکن میں اس سے متفق

نہیں ہوں۔ مرد اور عورت کی محبت میں بھی انقلابات آتے رہتے ہیں بارہویں صدی کا عشق بیسویں صدی کا عشق نہیں ہے۔ پتھر اور دھات کے زمانے سے لے کے موجودہ مشینی دور تک عورت اور مرد کے باہمی تعلقات پر نظر ڈالئے۔ آپ کو برابر تغیر ارتقاء، تبدیلی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور اب مختلف سماجی احول میں انسانی عشق کی مختلف قدریں پایئے گا۔ شادی سے پہلے، شادی کے بعد، شادی کے رسم و رواج میں گھر میں، گھر سے باہر، بچوں کی نگہداشت اور ان کے مالکانہ تصرف میں، جائداد میں۔ رشتہ داری میں باہمی سوجھ بوجھ اور اشتراک عمل میں، زندگی کے ہر لحظہ میں اور ہر لمحہ میں، آپ عورت اور مرد کی باہمی محبت میں برابر تغیر دیکھئے گا اور اسکی مختلف صورتیں دیکھئے گا۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی سماج میں عورتیں مردوں کی غلام ہوتی ہیں تو دوسرے سماج میں مرد عورتوں کے غلام۔ ایک سماج میں مرد اپنا حرم عورتوں سے بساتا ہے تو دوسرے سماج میں عورت اپنا گھر مردوں سے بساتی ہے۔ کسی سماج میں مرد جائداد کا مالک ہے۔ اور عورت اس سے محروم ہے تو دوسرے سماج میں شخصی جائداد کا مرکز و مرجع عورت کی ذات ہے۔ معاشی حالات سازگار ہوں تو عشق زندہ رہتا ہے۔ اور نہ ہو تو مر جاتا ہے۔ اور پھر خاص حالات میں ایک عشق کے بعد دوسرا عشق کرتا ہے اور عورت ایک مرد کی محبت میں خودکشی کی ناکام کوشش کے بعد زندہ رہتی ہے اور کسی دوسرے سے محبت کرکے پانچ بچے پیدا کرتی جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ محبت کی قدر بھی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ ان میں ہمیشہ تغیر پیدا ہوتا رہتا ہے۔ زندگی میں ہر عورت لیلیٰ نہیں ہے؟ اور ہر مرد مجنوں نہیں ہے۔ اس لئے ادب میں ہر داستان لیلیٰ مجنوں کی داستان نہیں ہو سکتی۔ بلکہ زندگی میں بھی اس قسم کی تمثیلیں بہت کم ہیں۔ ان کی حیثیت کلیہ کی نہیں ہے بلکہ مستثنیٰ کی ہے تو گویا یہاں بھی عشق کی ایسی قدر مستثنیات میں سے دکھائی دیتی ہے۔ اس لئے اسے ابدی قدر کا

مترادف جتانا حقیقت کو جھٹلانا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ صرف انقلاب کو اور تغیر کو اس دنیا میں دوام حاصل ہے اور کسی چیز کو نہیں اور جس روز انسان نے اور اسکے سماج نے اور اسکے ادب نے، اور اس کے تخیل نے اس تغیر، اس انقلاب کا ساتھ نہ دیا وہ بھی مٹ جائے گا ان جانوروں کی طرح جو آج سے ہزار ہا سال پہلے موجود تھے لیکن ارتقائی عملے پر کاربند نہ ہونے کی وجہ سے معدوم ہو گئے اس لئے ہم تو کسی ایسی موہوم، غیر واضح، غیر متعین ابدی قدر کے قابل نہیں ہیں۔ ادب میں ابدیت ایک بہکانے والا فلسفہ ہے اور اس میں بیکار کی موشگافیوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں اور ہمیں تو اس امر کا اعتراف کر لینے میں کوئی تامل نہیں کہ ہم ابدیت اور ابدی قدروں کے پجاری نہیں ہم تو لمحے کے شاعر ہیں، ایک لمحے کے داستان گو ایک لمحہ جواب ہے۔ ایک لمحہ جو کبھی تھا ایک لمحہ جو اب آئے گا تینوں لمحے جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ایک دوسرے سے مماثلت بھی رکھتے ہیں جیسے بیج زمین میں اور جڑیں کھاد میں اور پھول پتیاں ہوا میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ایک دوسرے سے مماثلت رکھتی ہیں۔ ہم اس زندگی کے پجاری ہیں جو حرکتی ہے۔ جامد نہیں۔ جو زندہ ہے مردہ نہیں ہے جو تغیر پذیر ہے موت کی طرح ساکن نہیں ہے۔ کیچڑ اور کنول میں جو کیچڑ سے پیدا ہوتا ہے اور اس شہد میں جو کنول سے نکلتا ہے بہت فرق ہے اور یہ امتیاز تغیر سے پیدا ہوا ہے۔ اور یہ تغیر پہلے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے درجہ میں ملتا ہے اور ہر منزل پر بلند ہوتا جاتا ہے۔ لوگ جسے حسن کہتے ہیں وہ تغیر ہی کی ایک صورت ہے اور اگر حسن کی تخلیق ہی ادب کا بہترین مصرف ہے تو اسکی تخلیق کم از کم ان ادیبوں سے نہیں ہو سکتی جو دوامی قدروں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہیں اور اپنے ذہن کے غیر سماجی مرمریں محل میں اپنے جامد تخیل کے ہیولے میں ایک فرضی اور موہوم غیر حقیقی فلسفے کی تشکیل و ترتیب سے

ایک زندہ متحرک توانا ادب کے پہاڑ کو روکنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ ادب کا ناطہ عوام سے توڑ لینے پر تلے ہوئے ہیں اور اسے ادب کے لفظی حصار میں قید کر دینا چاہتے ہیں۔ عوام سے موہنہ موڑ کر اور عوام کے جذبات کو نہ سمجھتے ہوئے یہ بھی نہ جانتے ہوئے کہ عوام کیا سوچتے ہیں، کیا کھاتے ہیں کیا پہنتے ہیں کس طرح رہتے ہیں کس طرح محبت کرتے ہیں۔ ان سب زندہ حقیقتوں سے پرے جا کر جن میں زندگی کی خوشیاں، زندگی کا کرب، اور اس کا بیکراں درد چھپا ہوا ہے ان سے بھاگ کر خیالی خولی اپنے ذہن کے تاریک گھروندے میں چھپ کر ہم کس طرح اس ادب کی تخلیق کر سکتے ہیں جو انسان کے لئے معراج مسرت ہے اور اسکی آرزؤں اور تمناؤں کا منبع ہے؟ زندگی سے بھاگ کر نہیں بلکہ اس بے قرار ہر دم بدلتی ہوئی زندگی کے درمیان کھڑے ہو کر اسکی کشا کش اور کشمکش میں حصہ لے کر ہی ہم سچائی اور حسن اور خوب صورتی کی ترتیب و تواتر سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ ایک سچے ادب، ایک حسین ادب، ایک خوبصورت اور توانا ادب کی تعمیر کسی اور ڈھنگ سے ممکن نہیں!

ایک اور بات ہے جس کے امکانات پر ہمیں غور کرنا ہے وہ ہے ذراتی توانائی کا دور، جو ہیرو شیما کی بمباری سے شروع ہوتا ہے اور جسکی تکمیل کے امکانات اگلے پچیس برسوں میں پورے ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ذراتی انرجی کے ہم پہنچ جانے سے جہاں سائنس کے سامنے ایک نیا تجرباتی دور کھل گیا ہے وہاں اسکے تخریبی پہلوؤں پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ابھی تو ذراتی انرجی کی تباہ کاریوں کی شروعات ہیں اور اگر ہمارے سائنس دان اور سیاست داں اور ماہرین جنگ اسکے تخریبی عناصر پر اسی طرح زور دیتے رہے اور اگر جلد یا دیر اسکا کوئی توڑ یا تعمیری حل دریافت نہ کیا گیا تو اگلے بیس پچیس برسوں میں موجودہ انسانی نسل کی بقا کا مسئلہ بہت مشکل نظر آنے لگے گا۔ اس بات کی تو

مجھے امید ہے کہ سائنس کبھی نہ کبھی ذراتی انرجی کی تباہ کاری کا توڑ دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ لیکن جو چیز میرے پیش نظر اس وقت سے وہ ہے جنگ کے بڑھتے ہوئے مہلک اثرات ۔ پچھلی تمام جنگوں سے گزشتہ جنگ عظیم زیادہ مہلک تھی اور موجودہ جنگ جو کرۂ ارض کے تمام خطوں پر پھیلی ہوئی تھی گزشتہ جنگ عظیم سے عظیم تر تھی۔ اور اگر سائنس کی ترقی کی وجہ سے موجودہ جنگی سلحہ جات میں اسی طرح اضافہ ہوتا رہا اور ان کی ہولناکی اسی طرح بڑھتی رہی تو بہت ممکن ہے کہ اگلی جنگ میں نہ آدمی زندہ رہے نہ اس کا ادب۔ سائنس دانوں کو کچھ کچھ احساس بھی ہو چلا ہے اور اب وہ انگلینڈ میں اور امریکہ میں اپنی انجمن بنا کر خود ہی ذراتی انرجی کے تخریبی عناصر کی روک تھام کے لئے تجاویز پیش کر رہے ہیں ـــ ترقی پسند ادیبوں کو بھی ان تمام تجاویز کی حمایت کرنا چاہئے۔ جو جنگ کے مہلک اثرات کی روک تھام کے لئے مختلف ممالک کے لئے ترقی پسند عناصر کی طرف سے پیش کی جائیں۔ لیکن اس سوال کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک تو ہے ذراتی انرجی کے کنٹرول کو کسی بین الاقوامی انجمن کے سپرد کر دینا۔ لیکن یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں جتنا آسان اسے سمجھا جا رہا ہے کیونکہ مجھے تو یہ بھی شبہ ہے کہ امریکہ کی تجارتی اداروں کو شاید ذراتی انرجی کا استعمال اب تک معلوم ہو گیا ہوگا۔ اور اگر نہیں ہوا تو دو چار سال میں ضرور ہو جائے گا یہ کوئی ایسا بھید نہیں جو چھپایا جا سکے۔ اس لئے آئندہ جب بھی جنگ ہوئی اسے استعمال کیا جائے گا۔ اور پھر اس کے جو مہلک اثرات ہوں گے وہ کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ اس لئے ذراتی انرجی کے بین الاقوامی کنٹرول سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔ ہاں شروع شروع میں اس کی روک تھام کے لئے وقتی نتائج ضرور حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اصلی چیز تو جنگ ہی کی روک تھام ہے اور جنگ کی روک تھام اس وقت تک نہیں ہو سکتی اور

اس کا مکمل انسداد اسوقت تک نہیں ہو سکتا جب تک دنیا میں فاسیت اور استعماریت اور دوسرے ایسے سماجی ادارے موجود ہیں۔ جو ایک انسان کو دوسرے انسان کی غلامی میں منسلک کرتے ہیں۔ جب تک دنیا میں منافعہ کا رواج ہے جب تک کہ ذرایع پیدایش شخصی جائداد ہیں۔ جب تک ادب سرمایہ پرستی کا غلام رہتا ہے جب تک پریس پر بینکروں کا قبضہ رہتا ہے اور جب تک مشینوں کو اور انسانی ہاتھوں کی پیداوار کو جمہوری اشتراک کے اصولوں پر تقسیم نہیں کیا جاتا۔ اس دنیا میں امن قایم نہیں ہو سکتا۔ سچی آزادی نہیں آسکتی۔ آزاد اور پائندہ ادب نہیں تعمیر ہو سکتا۔ اور مسرت اور ہمت اور توانائی اور ترقی اور حسن کی تجلیوں سے انسانی کائنات کا سینہ نہیں معمور ہو سکتا۔ اس لیے جنگ کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لئے ذراتی انرجی کی ہولناکیوں سے نجات پانے کے لئے ایک ہی راستہ ہے۔ زندہ متحرک، آگے بڑھتی ہوئی پھیلتی ہوئی رواں دواں اشتراکیت اس کے بغیر انسان کا مستقبل خطرے میں ہے۔ اور میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اب انسانی سماج اس درجے پر پہنچ گیا ہے اور جماعتی تضاد اس قدر تیز ہو گیا ہے کہ اب اس مسئلہ سے گریز ممکن نہیں۔ اب تو ہمیں یہاں آگے بڑھنا ہے یا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جانا ہے۔ جس طرح آج سے قرن ہا قرن پہلے بہت سے جانور مٹ گئے اور اب انکی ہڈیوں کے نشان آثار قدیمہ کی کھدائی میں دستیاب ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر انسانی شعور نے اسوقت فیصلہ نہ کیا اور تاریخ کے تقاضے کو اور اسکی انقلابی اہمیت کو نہ سمجھا تو یہ انسانیت اور اسکی تہذیب اپنے ہاتھوں خودکشی کرلے گی۔ اور پھر آج سے سیکڑوں ہزاروں سال بعد جب کوئی نیا جانور اس دنیا کو بسائے گا تو وہ اس دور کے آثار قدیمہ میں اس احمقانہ نظام زندگی کا سراغ ڈھونڈے گا جس نے اسے مرجانے پر مجبور کیا جس نے انسان کے

لئے ابدیت کو اور اسکی نسلی، تہذیبی، ادبی، سماجی، بقاکو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناممکن الحصول بنادیا۔ اور وہ سوچے گا کہ اگر انسان ایسا فیصلہ نہ کرتا تو کیا ہوتا۔ یہ اگر انسانی تاریخ کا سب سے بڑا "اگر" ہوگا۔ لیکن میں انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں میرا اعتقاد ہے کہ ہم لوگ صحیح فیصلہ کرینگے اور اپنی متحدہ کاوشوں سے اپنے ملک کے رہنماؤں کو اور دنیا کے رہنماؤں کو اس بات پر مجبور کریں گے کہ وہ صحیح راہ اختیار کریں اور حب منفعت کی خاطر یا جماعتی مفاد کے لئے یا عدم تدبر کی بنا پر پوری انسانیت کو خودکشی کرنے پر مجبور نہ کریں اس سلئے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہر ترقی پسند ادیب کو اس وقت نہایت شد و مد سے اشتراکی نظام زندگی کی حمایت کرنا چاہیئے۔ کہ انسانیت اب ایک نازک موڑ پر آگئی ہے جہاں اب اس سے گریز ممکن نہیں اور اگر ایسا نہ ہو تو یہ ایک ایسی مجرمانہ غفلت ہوگی جسکی سزا ہم سب لوگ بھگتیں گے۔ وہ لوگ جو اس مسئلہ کو سمجھتے ہیں اور وہ لوگ جو اس مسئلہ کو نہیں بھی سمجھتے ہیں۔

یہاں تک تو مقاصد کا تعلق تھا اب ایک آخری بات رہ گئی ہے اور وہ ہے ترقی پسند مقاصد و اغراض کی نشر و اشاعت چونکہ یہ اردو کے مندوبین کی کانفرنس ہے اس لئے میں اپنی زبان کے مسائل پر اکتفا کروں گا۔ یہاں میں یہ بات نہایت صراحت سے کہدینا چاہتا ہوں کہ میں اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھتا ہوں اور مجھے اسکی تاریخی ارتقاء کا مطالعہ ابھی تک اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ میں اسے صرف مسلمان قوم کی زبان نہ سمجھوں۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس زبان کے غالب حصہ پر مسلم قوم کی تہذیبی چھاپ ہے اور ہندوؤں نے اسکی ترویج و اشاعت میں بھی مسلمانوں سے کم حصہ لیا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے جھٹلانے سے خود فریبی کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لیکن اس بدیہی امر کے باوجود اس بات کو بھی کوئی جھٹلا نہیں سکتا کہ ہندوؤں نے اور اس

ملک کی دوسری قوموں نے بھی اردو کی اشاعت میں، اسے پھیلانے میں، بڑھانے
اور اپنانے میں ایک معتد بہ حصہ لیا ہے اور دوسری قومی زبانوں کی ترقی کے
باوجود اور فرقہ وارانہ رجحانات کی افزائش کے باوجود اور اس بدنصیب ملک
کی کوتاہ سیاست کے باوجود مسلمانوں نے اور ہندوؤں نے اور سکھوں نے
اور دوسری قوموں نے سب نے ملکر اسکی ترقی کے لئے اپنے بہترین انسان کا
لہو دیا ہے۔ منافقت کی دنیا میں بھی وہ ایک پودا ہے جس کی آبیاری ہم سب نے
مل جل کر کی ہے اور اسے ایک پھول کی طرح ایک معصوم تبسم کی طرح ایک مقدس
گیت کی طرح حرز جاں بنا رکھا ہے۔ اس لئے ایک ایسی زبان کو جسے ہندوستان کی
مختلف قوموں نے مل کے تخلیق کیا ہے کسی ایک قوم کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے
لئے وقف کر دینا ایک ایسی زبردست تہذیبی اور تاریخی غلطی ہو گی جس کی مثال
دنیا میں مشکل سے ملیگی۔ اگر امریکہ اور انگلینڈ دو مختلف قومیں ہوتے ہوئے
ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور ہونے ہوئے بھی ایک زبان کو رکھ سکتے
ہیں اور اسے اپنی تہذیبی روح کا مرکز بنا سکتے ہیں تو ہندوستان، اور
پاکستان ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی کیوں اس زبان کو اپنا نہیں سکتے۔
جسے انہوں نے خود تعمیر کیا ہے۔ پھیلایا ہے۔ آگے بڑھایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں
کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کو حق خود ارادیت دینے کے باوجود
اور دوسری صوبائی زبانوں کو پروان چڑھانے کے باوجود ایک ایسی
زبان کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ جو اس ملک کی تمام قوموں کی زبان
بن سکے۔ میرے خیال میں اردو اس ضرورت کو کس حد تک پورا کرتی ہے اور ہمیں
تمام پریشانیوں اور دقتوں اور مزاحمتوں اور سیاسی منافقتات کے باوجود اسکی
ترویج و اشاعت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھنی چاہئے۔ اسکے دائرہ اقتدار کو
ایک ہی قوم پر محدود نہ کرکے یہ کوشش کرنی چاہئے کہ یہ ہندوستان کی

تمام قوموں کی باہمی زبان بن جائے۔ اسکے لئے اگر ہمیں دوسری قوموں کے
تہذیبی عناصر کو جگہ دینا پڑے تو دینا چاہیئے۔ ہمیں ہر نہج سے ہر ڈھنگ سے
ہر ممکن کوشش سے اسے پورے ہندوستان کی، اسکی ساری قوموں کی
ان کے کلچر کی اور ان کے تہذیبی کارناموں کی زبان بنانا چاہیئے۔ میں اس میں
اردو کی ترقی دیکھتا ہوں اور اسی میں ہندوستانی کلچر کے HIGHER
SYNTHESIS کی بنیاد دیکھتا ہوں۔ جو آگے چل کر پورے ایشیا کی تہذیبی
ترقی میں برابر کی حصہ دار ہو سکتی ہے۔

ترقی پسند اغراض و مقاصد کی اشاعت کے لئے جہاں ہمیں اپنی زبان کے
دائرہ عمل کو وسعت دینا ہے۔ وہاں ہمیں اپنے ادب کے ان پہلوؤں پر بھی غور
کرنا ہے جن پر ابھی کوئی کام نہیں ہوا جو ابھی ہماری کوتاہیوں کے پیش نظر
تشنۂ تکمیل ہیں۔ جدلیاتی تاریخ، سائنس، فلسفہ، معاشیات، سیاست
ان تمام امور پر علمی کتابوں کی شدید ضرورت ہے۔ ترقی پسندی کی اس بنیادی
مشق کی طرف ابھی تک ہم نے کوئی کام نہیں کیا۔ مزدوروں اور کسانوں تک
پہنچنے کے لئے بھی بہت سے کام کی ضرورت ہے سستی کتابوں کی ضرورت ہے اور
آسان سلیس زبان میں لکھنے کی ضرورت ہے اور اس نقطۂ نگاہ کی ضرورت ہے
جو مزدوروں اور کسانوں کی ضرورت کو پورا کر سکے اور انہیں زندگی کے مسائل
سے آگاہ کرے وہاں ان کے لئے ایک صحت مند نشاط کا سامان بھی مہیا کر سکے
ہمارا ادب اور ہماری ادبی کاوشیں اس لحاظ سے بڑی حد تک بار آور اور مشکور
نہیں ہیں۔ ہمارے ترقی پسند ادب کے مواد کا بیشتر حصہ اور اس کا خمیر متوسط
طبقے سے اٹھایا گیا ہے اور یہی طبقہ ہماری توجہ کا مرکز ہے۔ ایک حد تک موجودہ
صورت حال میں یہ ناگزیر بھی ہے لیکن اب ہمیں اس حصار کو توڑنے کی
کوشش بھی کرنا چاہیئے۔ اپنی آواز کو مزدوروں اور کسانوں کا

ترجمان بنانا چاہیے۔ اس حد تک نہ صرف متوسط طبقہ ہماری آواز سے بلکہ کسان اور مزدور بھی اس سے مستفید ہوں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اگر ہمیں عام فہم بننا پڑے صحافیت کا سہارا لینا پڑے۔ اپنے ادبی معیار کو کم کرنا پڑے تو بھی میں اسے اپنے اغراض و مقاصد کے پیش نظر اسے جائز سمجھوں گا۔ اس لئے ادب کا منبع اور سرچشمہ عوام ہیں۔ اسی سرچشمہ سے ہم لوگ سیراب ہوتے ہیں۔ یہی سرچشمہ ہمیں قوت بخشتا ہے اور حیات عطا کرتا ہے اور اگر ہم نے بدستور اس سرچشمہ سے اپنا منہ موڑے رکھا اور اسے قابل اعتنا نہ رکھا تو ہمارا ادب سوکھ جائے گا۔ اور اسکی جیتی جاگتی بہاروں میں خزاں آجائے گی۔ اور وہ مقصد جسے ہم لے کر اٹھے ہیں کبھی پورا نہ ہوگا۔

بوری بندر

جب کرشن چندر بوری بندر کے سٹیشن پر پہنچا تو اُس نے
دیکھا کہ سید سجاد ظہیر جو کمیونسٹ ہونے کے باوجود اپنے
اپنے نام کے پہلے سید لکھتے ہیں، کچھ اداس، کچھ پریشان سے
کھڑے گیارہ نمبر کے پلیٹ فارم کے باہر اُس کی راہ دیکھ رہے
ہیں۔ پستہ قد مصنف نے جس کے فراخ ماتھے سے بال بڑی
تیزی سے غائب ہو رہے تھے اور جس نے اپنی بے چین آنکھوں
کو عینک کے دبیز شیشوں سے ڈھانپ رکھا تھا سید سجاد ظہیر کے

قریب جاکر ملتجیانہ انداز میں معذرت پیش کرنے کی جرأت کی۔

بھئی ـــــ سید سجاد ظہیر نے شروع کیا۔ لیکن کرشن چندر اسی لمحے بول اٹھا۔ بھئی معاف کرنا، دیر ہو گئی۔ اس نے اپنے لبوں پر ایک جھوٹی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ یہ لو دیکھو۔ ملاڈ سے آرہا ہوں۔ یہاں سے اٹھارہ میل کا فاصلہ ہے۔ پھر بیوی بچوں سے بھی رخصت ہونا تھا۔ اور کمبخت یہ سامان ساتھ تھا اور نوکر عین وقت پر کہیں بھاگ گیا۔ اور ۔۔۔۔۔۔

بس کرشن چندر اسی طرح بے ربط جملے کہتا جا رہا تھا۔ بظاہر بے ربط لیکن بباطن بدرجہ غایت مرتب جملے۔ یہ بے ربطی اُس کے افسانوں میں ہے۔ اُس کی زندگی میں بھی نظر آتی ہے۔ لوگ بہر صورت دھوکا کھاتے ہیں۔ بے چارے وہ مسکرا رہا تھا۔ سید سجاد ظہیر کے لبوں تک بھی اک مسکراہٹ آئی۔

کس قدر لطیف، پاکیزہ، نورانی مسکراہٹ تھی۔ سید سجاد ظہیر اطوار و گفتار میں بالکل چمڑے کے سوداگر معلوم ہوتے

ہیں اُن کی متین اور خاموش صورت دیکھ کر کوئی اُن کی جودتِ طبع کا اندازہ نہیں کر سکتا لیکن جب وہ مسکراتے ہیں۔ تو ذہانت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ تبسّم ہے کہ ہنستا ہوا کنول ہے، شوخ ہے، خوبصورت ہے، دل کش ہے، نور کا فوارہ ہے۔ تخیّل کا کوندا ہے، ذہانت کی لہر ہے، اُڑتی ہوئی۔ بل کھاتی ہوئی آگے بڑھتی ہوئی۔ ہیجانی، سیلابی، طوفانی، چشم زدن میں ایک سیدھے سادے، موٹے موٹے، روکھے روکھے، چہرے کو سرسبز شاداب بنا دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید سجاد ظہیر کے پاس اس تبسّم کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ (شاید اب وہ ہر روز آئینے میں دیکھ کر مسکرایا کریں گے ایں واللہ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ تبسّم ہیچ بیچ...... بخدا)

سید سجاد ظہیر نے مسکرا کر صاف کر دیا۔ چلو بھئی۔ بس اب ...... یہ لو اپنا ٹکٹ۔ گاڑی چھوٹنے میں چند منٹ باقی ہیں اتنا کہہ کر انہوں نے گھبرا کر پلیٹ فارم کی گھڑی کی طرف دیکھا۔ دفعتًا علی سردار جعفری سر پہ آن کھڑے ہوئے اُن کی

بے کر برز پتلون، بڑھے ہوئے بال اور گھونسہ مارکہ چہرہ بڑے بڑے جغادری ادیبوں پر رعشہ طاری کر دیتا ہے۔ کرشن چندر نے انھیں آتے دیکھ کر اپنی پلکیں جھپکائیں اور ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ لیکن ان حرکتوں سے کیا ہوتا تھا۔ سردار نے بڑے زور سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "کیوں بھائی، یہ کیا حرکت ہے، اس وقت چلے آ رہے ہے گیارہ بجے کا وقت نہیں دیا تھا؟ اب دیکھو ایک بج رہا ہے، خیر اب جلدی سے سامان..... یکایک سید سجاد ظہیر نے چونک کر کہا" ہاں بھئی چلو " خدا جانے اب تک وہ وہاں کھڑے کیا سوچ رہے تھے۔

ـــــــــ گاڑی میں

تھرڈ کے ڈبے پر " سکندر آباد " لکھا تھا۔ سکندر آباد جو حیدر آباد دکن میں واقع ہے۔ تھرڈ کا ڈبہ جو نظام اسٹیٹ ریلوے کی ملکیت تھا اس وقت بوری بندر کے سٹیشن پر کھڑا تھا۔ اور مسافر اس میں گڑ کی بھیلیوں کی طرح لدے ہوئے تھے۔ نظام اسٹیٹ ریلوے کے تیسرے درجے کے ڈبوں میں بھی بجلی کے پنکھے لگے ہوتے ہیں، چنانچہ جہاں ترقی پسند ادیبوں کا گروہ بیٹھا تھا وہاں اتنی گھٹن نہ تھی۔ دراصل ان

لوگوں نے اپنے بیٹھنے کے لئے اچھی جگہ حاصل کرلی تھی، پورے ڈبہ میں صرف دو پنکھے تھے اور جہاں یہ پنکھے تھے وہیں ترقی پسند ادیب بھی تھے، دونوں پنکھوں کے نیچے آمنے سامنے ٹولیاں بنا کے بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی میں اس لئے بیٹھے تھے کیونکہ حیدرآباد دکن جا رہے تھے، اور حیدرآباد دکن اس لئے جا رہے تھے کہ وہاں اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی کل ہند کانفرنس تھی۔

ایک ٹولی میں سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر ملک راج آنند، مدن گوپال، سبطِ حسن، اوپندر ناتھ شامل تھے، دوسری ٹولی میں علی سردار جعفری، رفعت سروش، قدوس صہبائی، عادل رشید، کرشن چندر اور کیفی اعظمی تھے۔ کیفی اعظمی نے اپنی ہیئت ایک چرس پینے والے فقیر کی سی بنا رکھی تھی، وہ ایک بوسیدہ کمبل اوڑھے ہوئے، کھڑکی سے ٹیک لگائے، آنکھیں بند کئے اونگھ رہے تھے اور دوران سفر میں کبھی کبھی آنکھیں کھول کر کمال حیرت و استعجاب سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ لیتے ان کی نگاہ گویا کہہ رہی تھی۔ ہائیں۔ تم لوگ ابھی تک اس ڈبے

میں ہو۔ کچھ کھا کے سو کیوں نہیں گئے۔ اُن کی شکایت آمیز نگاہوں کا نوحہ ادیبوں کے لئے اک مسلسل مرثیہ تھا۔ عادل رشید اپنی سیٹ پر اس طرح بیٹھے تھے گویا فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہوں، سبط حسن، اور مہندر ناتھ نے دُنیا کی بے ثباتی اور موجودہ دَور کی رجعت پسندی پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد شطرنج بچھا لی تھی اور مہروں کو پیٹنے میں مصروف ہو گئے کیونکہ امیر لوگوں کو پیٹنے سے تو یہ لوگ رہے، رفعت سروش کا سنولا چہرہ اپنی معصومیت اور خطرناک سادگی کی مکمل رعنائیاں لئے ہوئے ایک سرمئی کبوتر کی طرح نظر آ رہا تھا۔ جو اپنی چھتری پر بیٹھا ہوا بڑی بے صبری سے دانے کا اظہار کر رہا ہو۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی اس کے کان میں چپکے سے کہدے "غٹر غوں۔ —— بول کبوتر بول!"

گاڑی کے چھوٹنے میں ابھی دو منٹ باقی تھے کرشن چندر نے جو حال ہی میں کسی فلم کمپنی میں ملازم ہوا تھا اپنی نئی امارت جتانے کے لئے چار روپے کے سنگترے پھل والے سے خرید کئے

اور انھیں اپنے ساتھیوں میں بانٹنے لگا ازل کا بھوکا اور کمینہ ساتھ ساتھ کہتا جا رہا تھا۔ لو بھئی کھاؤ نا۔ ارے یار۔ بہت میٹھے ہیں یہ سنگترے۔ اور چہرے پر وہی جھوٹی مسکراہٹ تھی۔ خوب ہیں یہ سنگترے۔ رنگترے۔ رس بھرے۔ ارے بھائی۔ اس میں ڈاہلن بھی ہے، اماں یار ایک تو چکھو" پلکیں جھپکا جھپکا کر وہ سنگترے تقسیم کر رہا تھا۔ راک فیلر کا سالا!

ادیبوں کے کاہن ملک راج آنند اور سید سجاد ظہیر آمنے سامنے بیٹھے تھے، دونوں براق کھدر میں ملبوس تھے۔ سجاد ظہیر کے کھدر کا رنگ سپید تھا۔ تو ملک راج آنند کا رنگ جوگیا تھا۔ لیکن لباس دونوں کا وہی تھا۔ وہی ٹوپی، وہی جواہر جیکٹ، وہی پائجامہ، ملک راج آنند کے منہ میں پائپ تھا۔ تو سید سجاد ظہیر کے لبوں پر تبسم، ملک راج آنند کے گداز اور سرخ گلے اور اس کے بھرے بھرے فربہ ہونٹ انگلستان کی آسودگی کے مظہر تھے۔ ان کے پائپ کا دھواں اڑ کر چھت کی طرف جاتا تھا۔ اور پھر یکا یک

پنکھے کی ہوا سے فضا میں منتشر ہو جاتا تھا۔ آنند اور سجاد ظہیر دونوں ادبی کانفرنس کے پروگرام طے کر رہے تھے اور مدن گوپال جنھوں نے منشی پریم چند کے آرٹ پر ایک کتاب انگریزی میں لکھی ہے اُن کے قریب بیٹھے ہوئے ان دونوں ادیبوں کی گفتگو اس انہماک سے سُن رہے تھے۔ گویا کسی الہامی تفسیر سے روشناس ہو رہے ہوں۔ مدن گوپال کا خاصہ یہ ہے کہ وہ محض اپنی خاموشی ہی سے لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ مہندر ناتھ اور سبط حسن کبھی کبھی بساط سے گردن اٹھا کر نگاہ پھیر کر ڈبے میں چاروں طرف دیکھ لیتے اور کہیں آسودگی نہ پا کر پھر مہردں کو پیٹنے میں مصروف ہو جاتے۔ قدوس صہبائی مدیر نظام تکیہ کا سہارا لئے منہ میں یوکلپٹس کی گولی ڈالے دونوں ٹانگیں سکیڑے اس طرح بیٹھے تھے گویا پرانی بواسیر کے شکار رہیں۔ کرشن چندر نے ازراہ ہمدردی اُن سے کہا " لیجئے۔ آپ بھی کھائیے نا! "

" شکریہ " وہ بولے " مجھے تو نزلہ ہے " اس کے بعد

انھوں نے خود سگرٹ پیش کیا "لیجئے"

"شکریہ" کرشن چندر نے انکار کرتے ہوئے کہا "مجھے تو پیچش ہے۔ اور پیچش میں تمباکو —— آپ خود جانتے ہیں؟

میں خوب جانتا ہوں۔ قدوس صہبائی نے شہیدوں کا سا تبسم اپنے چہرے پر لاکر کہا "مجھے دس سال سے پیچش ہے"

"مجھے پندرہ سال سے ہے" کرشن چندر نے عاجزی سے کہا۔

"اور میرے نرخرے کے اعصاب میں ورم بھی ہے"

قدوس صہبائی نے نہایت انکسار سے جواب دیا۔

"میری آنتوں میں سوزش ہے۔ اور دل میں اختلاج ہے اور جگر میں پتھری ہے" کرشن چندر نے نہایت مسکین، میٹھے لہجے میں کہا۔ "ڈاکٹر کہتے ہیں۔ میں صرف تین سال تک زندہ رہوں گا خدا کرے میرا وہ ناول مکمل ہو جائے"

"کون سا ناول؟" قدوس صہبائی نے پوچھا "کوئی نیا ناول آپ لکھ رہے ہیں، بھئی ذرا جی لگا کے لکھئے گا۔ وہ آپ کا

ناول ــــ "شکست" ـــ تو بالکل ـــ معاف کیجیے گا ـــ بھئی فلاپ ہے۔ بالکل ......"

کرشن چندر سنگترے کی پھانک کھاتے کھاتے اُس کے کڑوے بیج بھی نگل گیا۔ کہنے لگا۔ "ذرا یہ ـــ اس پنکھے کا رخ اس طرف موڑ دیجیے۔ اف کس قدر گرمی ہے۔ دم گھٹا جارہا ہے۔"

قدوس صہبائی نے مسکرا کر کہا۔ "یہ یوکلپٹس کی گولی لیجیے مفرح ہے۔"

"وہ مارا ـــ وہ مارا ـــ دوستو ـــ وہ مارا"

یکایک مہندر ناتھ دھاڑا۔

"کیا بات ہے۔ کیا بات ہے" یکایک کیفی اعظمی نے گھبرا کر اور آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"دوستو۔ میں کچھ نہیں کہتا۔ بس اسی سبط حسن سے پوچھو مات دیدی اسے کہ نہیں؟ وزیر اور فیل اور سب پیادے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ دوستو!"

سبط نے اپنے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اک نستعلیق انداز میں کہا۔ "ااں۔ ہٹاؤ بھی۔ کیوں شور مچاتے ہو بے کار۔ آخر پنجابی ہو نا۔ تو آؤ۔ اب کے تمھیں مات نہ دیدیں تو ——"

گارڈ نے یا خدا جانے کس نے سیٹی بجائی اور گاڑی چلنے لگی۔ ادیب گاڑی سے باہر جھانکنے لگے۔ لیکن ان بیچاروں کو الوداع کہنے والا وہاں کون تھا۔ ایک خوبصورت ایرانی عورت اپنے خاوند کو الوداع کہہ رہی تھی۔ ایک پارسی لڑکی قوس قزحی ساڑھی پہنے دوسرے درجے میں کھڑی رومال ہلا رہی تھی۔ اور اُس کا محبوب پیار بھری نگاہوں سے اُسے تکتا گیا۔ اور گاڑی آہستہ آہستہ چلتی گئی۔ ایک مرہٹے نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ شولاپور پر بھائی صاحب تجھے گاڑی سے اتاریں گے۔ گھبرائیو نہیں۔" لیکن ان ادیبوں کے لئے وہاں کوئی نہ تھا۔ نہ باپ۔ نہ محبوب نہ مداح۔ بیچارے خود ہی ہاتھ ہلا ہلا کے رہ گئے۔ اور

جب گاڑی پلیٹ فارم سے باہر نکل گئی۔ تو پھر اپنی سیٹوں پہ آن بیٹھے اور بے بسی کے عالم میں اونگھنے لگے۔

کرشن چندر جب اُداس ہوتا ہے تو سیگرٹ پیتا ہے لیکن خود خرید کے کبھی نہیں پیتا ہے۔ ہمیشہ دوسروں سے مانگ کر پیتا ہے، اُس کی اس عادت سے اُس کے دوست اچھی طرح واقف ہیں۔ اور اُسے اکثر پریشان بھی کیا کرتے ہیں۔ اس وقت بھی کرشن چندر کو سیگرٹ کی طلب محسوس ہوئی لیکن اُسے کسی نے سیگرٹ نہیں دیا۔ نہ جانے ان لوگوں کے پاس سیگرٹ نہیں تھا۔ یا ان لوگوں نے اُسے پریشان کرنا ہی مناسب سمجھا۔ بہرحال اسے اپنے ساتھیوں سے سیگرٹ نہیں ملا۔ اور وہ مایوس ہوکر اور گردن جھکا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اور اس کے دل کی ویرانی اور بڑھ گئی۔ یکایک اُس کے قریب بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے کہنی مار کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ کرشن چندر نے دیکھا ایک کالا کلوٹا بدصورت نوجوان ہے۔ جس کے دانت بے حد سپید ہیں۔ اور اپنی

جلا سے موتیوں کو بھی شرماتے ہیں اور وہ اُسے سیگرٹ پیش کر رہا ہے۔ کرشن چندر نے شکریہ کے ساتھ اُس سیگرٹ کو قبول کیا۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ وہ نوجوان نظام اسٹیٹ ریلوے میں مزدور ہے۔ اور حیدرآباد دکن جا رہا ہے کرشن چندر کو یاد آیا۔ کہ سنگترے تقسیم کرنے وقت اُس نے اپنے ہمسائے کو سنگترہ نہیں پیش کیا تھا۔ کیونکہ اُس کے کپڑے نیلے رنگ کے تھے اور میلے کچیلے تھے۔ اور اُس کا رنگ کالا تھا اور وہ بدصورت بے ڈول، اور کریہہ منظر تھا۔ اور مزدور تھا۔ کرشن چندر نے سیگرٹ پیتے پیتے سوچا کہ وہ ابھی تک بورژوائی اخلاق کے تضاد میں گرفتار ہے سردار نے اُس کی ذہنی کشمکش کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا "دیکھا تم نے ایک پرولتاری کا اخلاق؟" اور پھر فوراً چُپ ہو گیا۔ رفعت سروش نے عادل رشید سے کہا۔ "بھئی ہمیں تو بھوک لگی ہے" سیٹ کے نیچے ایک ٹوکری میں کچھ سامان خورد و نوش بھی تھا۔ عادل رشید نے وہ ٹوکری اٹھا کر

اپنی را دن پر رکھ لی۔ اور اب وہ دونوں انڈے اور ڈبل روٹی۔
مکھن نکال نکال کر کھانے لگے۔ مکھن ٹین کے ڈبے میں بند تھا۔
اور چاقو کسی کے پاس نہ تھا۔ اس وقت وہی مزدور اپنے کام
آیا۔ اور سب لوگ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ اس مرتبہ بھی
کرشن چندر اپنے ہمسائے کو کھانے کے لئے پوچھنا بھول گیا۔
سب لوگ جلدی جلدی انڈے توس مکھن اور پھل ڈکار گئے۔
بہت عرصے کے بعد یکا یک کرشن چندر کو خیال آیا۔ اور اس نے
چونک کر کہا۔ "ارے بھئی۔ کچھ اسے بھی دیدیا ہوتا۔ اپنے
ساتھی کو۔"

مزدور مسکرایا۔ وہ اُن کا ساتھی تھا۔ لیکن انڈے توس
مکھن پھل کھانے والا ساتھی نہیں۔ وہ تو فرش خاک پر بیٹھ کر
تقریریں سننے والا ساتھی تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنے
چاقو سے مکھن کو الگ کیا۔ اور اُسے بند کر کے اپنی جیب میں
ڈال کر چار مینار کا سگرٹ پینے لگا۔

ترقی پسند ادیبوں کے علاوہ اس ڈبے میں کوئی سوڈیڑھ سو آدمی اور ہوں گے، دو مولوی تھے۔ چار سود خوار پٹھان تھے، آٹھ دس بنئے تھے جو دوسرے درجے میں سفر کر سکتے تھے لیکن روپیہ بچانے کی خاطر تھرڈ میں آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے کوئی پندرہ بیس ریلوے کے مزدور تھے، ایک چنا جور گرم بیچنے والا تھا۔ ایک دیسی عیسائی اپنی بیوی کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ بیوی نے اپنے تین بچے سیٹوں پر سُلا رکھے تھے۔ اور خود بھی نیلا سا یہ پہن کر پسکڑا مارے بیٹھی تھی۔ اس کی سیاہ اور مضبوط ٹانگیں گھٹنوں تک ننگی نظر آتی تھیں اور بالوں سے پُر تھیں۔ ٹخنوں پر اونچی ایڑی کے سپید سینڈل کا تسمہ بندھا تھا۔ اس ڈبے کے چار دروازے تھے۔ ہر دروازے پر مفلوک الحال کسان بوسیدہ چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے کھڑے تھے اور بلند آوازمیں باتیں کرتے جاتے تھے۔ کتنی عجیب باتیں تھیں وہ۔ زمین کی باتیں۔ بٹوارے کی باتیں جریب اور کھتونی کی باتیں۔ ہل کی باتیں۔ بیل کی باتیں۔ قحط کی باتیں۔ بیاہ کے لیے

بنئیے سے سود پر رقم حاصل کرنے کی باتیں گھر کو گروی اور زمین کو رہن کرنے کی باتیں۔ عجیب و غریب باتیں۔ نہ عشق و محبت کی باتیں۔ نہ حُسن جہاں سوز کی باتیں، ساقی کی باتیں نہ شراب ناب کی باتیں، مذہب کی باتیں نہ جنت کی باتیں اک بے پناہ شور تھا۔ اک مسلسل ہنگامہ۔ ایک مستقل دوزخ، اک آگ۔ اک بو، اک سڑاند، جیسے وہ گھر ڈ کا پورا ڈبہ انسانیت کا سنڈاس تھا۔ اور جس میں ترقی پسند ادیب اس طرح دھرے تھے جس طرح کوئی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر سیب کی سُرخ و سپید قاش پھینک دے۔

ڈاکٹر ملک راج آنند نے کہا "لیکن دوامی قدریں بھی ہوتی ہیں۔"

"بے شک بے شک"۔ مدن گوپال نے ٹھاکر کی طرح رٹتے ہوئے کہا۔

"کون سی دوامی قدریں ہوتی ہیں جناب؟" علی سردار نے گویا گھونسہ دکھاتے ہوئے کہا۔ سردار کے چہرے پر پیاسی مجروں

کی صعوبتوں کے تمام نشانات موجود ہیں۔ اس کی پیشانی
پر مستقبل کے نئے عزائم کی بڑ ہے۔ وہ جب بات کرتا
ہے۔ دانت پیس کر، قہر میں، ڈوب کر، اک جلالی مجذوب
انداز میں۔ جو بات چہرے میں ہے۔ وہی چال، ڈھال
میں، وہی گفتار میں، ایک تنا ہوا ٹھوس گھونسا، اک
جامد ہتھوڑا اور ہنسیا سرخ جھنڈا گویا اس کے چہرے
پر گڑا ہوا ہے۔ سردار کی ذاتی شخصیت اب گھٹتے گھٹتے صفر
ہو کے رہ گئی ہے۔ اس سے بات کیجئے۔ معلوم ہوتا ہے
آپ ایک کتاب پڑھ رہے ہیں۔ ایک تحریک کا سامنا
کر رہے ہیں [illegible] کی اک شق کا مطالعہ کر رہے ہیں
اک نئے انداز فکر سے دوچار ہو رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں
آتا کس [illegible] کے دل کو شاعر بنا دیا ہے۔ پھول سے کھل گئے۔
تصوریں۔ دامن شوق بھر گیا کوئی.....

ملک راج آنند نے پائپ کی راکھ جھاڑ کر اک مخصوص مدبرانہ انداز
میں کہا: یہی۔ خوبصورتی۔ ترتیب، بہترین جمال مجھے یہ جا کر افسوس ہوتا ہے کہ جہاں

ہندوستانی ادیبوں نے سماجی مواد کی فراہمی میں اتنی مستعدی سے کام لیا ہے۔ وہاں وہ اُسے پیش کرنے میں کمال فن کا ثبوت نہیں دے سکتے .... میری مراد ہئیت سے ہے۔ سماجی مواد خوبصورتی سے پیش کرنا ہی صحیح حُسن کاری ہے۔ جنگ کے دوران میں ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں نے کونسا ایسا قابل فخر کارنامہ.......

کرشن چندر نے جھلّا کر کہا۔ اور آپ کے انگریزی ادیبوں نے کونسا ایسا کمال کر کے دکھایا ہے۔ آپکے آڈن نے.......

آڈن بہت بڑا شاعر ہے جناب آنند نے جواب دیا۔ اس کی شاعری میں شیکسپیئر کے کلام کی سی عظمت ہے۔ کرشن چندر نے سُنی ان سُنی کر کے کہا۔ آپ کے آڈن نے، سپنڈر نے، لیک منس نے، مکسلے نے، برسٹلے نے، کوئی یوگا میں اُلجھ کے رہ گیا۔ تو کوئی سستی فلموں کے مکالمے لکھنے لگا۔ برسٹلے سیدھا سادا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ انگریزی استعماریت کے حق میں، ہوتے برعکس ہندوستانیوں کو صلواتیں سُناتے

سناتے ہیں ۔ کچھ لوگ اے ۔ آر ۔ پی ۔ پر کتابیں لکھ رہے ہیں
واہ رے حُسن کاری ....

یہ میں مانتا ہوں کہ ابھی تک بیشتر امریکی اور انگریزی
مصنف اس نیم جمہوری استعماریت کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔
اس لئے اُن کا خیال ہے ۔ کہ اُن کی تہذیب اور اُن کا سماج
اور ان کا اقتصادی نظام ابھی بیس پچیس برس اور چلے گا۔ اسلئے
وہ کیوں خواہ مخواہ اس سے لڑائی مول لیں ۔ اور اپنی روزی
خطرے میں ڈالیں ۔ وہ اتنے بیوقوف نہیں ہیں ۔ اب یوروپی
مصنفوں کو لیجئے ۔ جدید یوروپی شاعری کو جو فروغ حاصل
ہو رہا ہے ۔

"کہاں ہو رہا ہے؟" سردار نے جل کر کہا "ایک آراگان
کو چھوڑ دیجئے ۔ اور دو ایک اور کو ۔ باقی شاعروں نے کیا
اپنے آپ کو اور اپنے فن کو نازیوں کے حوالے نہیں
کر دیا تھا ۔ خاص طور پر فرانسیسی زوال پسندوں نے ۔ کہیئے
تو ایک نہیں درجنوں مثالیں پیش کر دوں ۔ ان الوقتی پر آدمشی

کو قربان کر دینے سے کبھی آرٹ یا آرٹسٹ عظیم نہیں ہو سکتا۔

APOEALYPTIES آنند نے شروع کیا لیکن اب اُس پر
چاروں طرف سے حملے ہو رہے تھے۔" کیفی نے جھنجھلا کے کہا۔"
اس گروپ کا کیا کہتے ہو۔ ایک ہی مجموعہ چھاپ کے رہ گئے
لغویات کا پلندہ چلے تھے۔ ومیش دیو مالا کے بل پر قوم کی
حالت سدھارنے۔ ومیش دیو مالا۔ جس میں انسانی بھیڑیوں
کے قصے ہیں۔ اور جہاں دوست کی بیوی کو بہکانا بھی دیوتائی
میں شامل ہے۔ کیا یہی ادب کی دوامی قدریں ہیں۔ کیا
انھیں قدروں کی بنا پر ایک نئے 'بہتر' اور بھرپور سماج کی
داغ بیل ڈالی جائے گی؟

"ارے کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہو۔ سردار نے کہا۔" وہ بیچارے
تو کب کے ختم ہو گئے۔ اب تو شاعری چھوڑ چھاڑ کے اپنے پیٹ
کا دھندا کر رہے ہیں۔

"بے شک بے شک" مدن گوپال نے دریں چہ شک کی گردان
دہرائی۔ اور عادل رشید بے ساختہ ہنس پڑے۔ جب پر

جس پر انھیں غصہ آگیا۔ اور وہ عادل رشید کو گھورنے لگے
آنند نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "بھئی ہم نے
بھی بہت پڑھا ہے۔ ہم نے بھی اقبال اور جوش کا مطالعہ کیا
ہے۔ لندن میں بیٹھ کے جھک نہیں مارتا رہا ہوں۔ مجھے تو معاف
کیجئے۔ ان میں کوئی عظیم بات نظر نہیں آتی۔ اقبال بہت اچھے ہیں
لیکن ان کا فلسفہ متضاد خیالات کا مجموعہ ہے۔ اور جوش
اردو میں تو بہت شور دغل مچاتے ہیں۔ لیکن جب بھی انگریزی
میں ترجمہ کرو۔ گھاس معلوم ہوتے ہیں۔ بالکل گھاس"۔

"آپ خود گھاس کھا گئے ہیں"۔ سردار نے غصے میں آکر
کہا۔" آنند صاحب پہلے آپ اس ملک کی حالت کا اندازہ
کیجئے۔ اس کی ادبی تحریکات کا مطالعہ کیجئے۔ اس کے سیاسی
رجحانات کا تجزیہ......

"دوستو!" مہندرناتھ نے چیخ کر کہا۔" دوستو۔ مار ڈالا۔
کچل کے رکھ دیا۔ دوستو میدان جنگ سے بھگا دیا"۔

"کیا ہوا بھئی؟" سجاد ظہیر نے سخت پریشان ہو کے

پوچھا۔

کچھ بھی تو نہیں۔ سبطے نے چیں بہ جبیں ہو کے کہا۔ بس ایک دفعہ اور بات کھل دیویں۔ جب سے گلا پھاڑ پھاڑ کے چلا رہے ہیں میرے یار۔ پنجابی ڈھگے ہیں نا آخر۔ تہذیب چھو تک نہیں گئی ہے۔ ہٹا دُ یہ بساط۔ ہم نہیں کھیلتے۔

لاؤ ہم تمہاری مدد کرتے ہیں۔ علی سردار جعفری نے اُسے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب۔آپ میری مدد کریں گے۔ آپ؟" سبطے نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"کیوں مجھے کیا ہوا ہے؟" سردار نے چونک کر پوچھا۔

"آپ؟" سبطے ہنسا۔

"ہاں میں!"

"آپ!"

"ہاں! ہاں میں!" اب سردار کو واقعی غصّہ آگیا۔

"تم!"

"میں !!"

"تم !!!"

"بے شک بے شک" مدن گوپال نے سر ہلا کے کہا۔ اور سب ہنس پڑے۔

گفتگو ایک لمبے عرصے کے لئے خود بخود بند ہو گئی۔ سجاد ظہیر، رفعت سروش، عادل رشید اور مہیندر ناتھ کسی نہ کسی طرح سو گئے جب یہ سب سو گئے۔ تو چرس پینے والا فقیر کیفی اعظمی اک گونہ بے خودی سے سرشار ہو کر گنگنانے لگا۔ قدوس صہبائی چسکی لے کر یوکلپٹس کی میٹھی گولی چوسنے لگے۔ آنند الکسی ٹالسٹائی کی ROAD TO CALVENY پڑھنے لگے۔ مدن گوپال نے پریم چند کے متعلق اپنا انگریزی شاہکار پھر سے پڑھنا شروع کر دیا اور اس پر پنسل سے نشان لگاتا گیا۔ گویا دوسرے ایڈیشن کے لئے اُسے نئی نئی باتیں ابھی سے سوجھ رہی تھیں کرشن چندر کا جی یان کھانے کو چاہ رہا تھا۔ لیکن گاڑی کہیں رکتی نظر نہ آتی تھی۔ اس نے سبط حسن سے کہا دم گھٹا جا رہا ہے۔

اگلے اسٹیشن پر اُتر کر ڈائننگ کار میں چلیں گے۔" سب طلبے نے تجویز پیش کی۔

"میں بھی چلوں گا۔" سردار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ یعنی ڈبے کے بیچ میں خاموشی تھی۔ ورنہ چاروں طرف شور تھا۔ اور کسان اور مزدور اور غریب بدصورت مفلوک الحال لوگ چلا چلا کے باتیں کر رہے تھے۔ اس قدر اکیلے، کمینے اور بھوکے لوگ وہ تھے۔ کہ اگر نہ چلاتے تو شاید پاگل ہو جاتے۔ اس خاموشی۔ کائنات کی اندھی بسیط گناہ گار خاموشی میں دب کر رہ جاتے۔ اسی لئے تو اُن کی رُوحیں" چیخ چیخ کر اپنی زندگی کا نوحہ بیان کر رہی تھیں۔ وہ ہنستے تھے بات کرتے تھے۔ مسکراتے تھے۔ خوش ہوتے تھے۔ غصے میں آ کر چیختے تھے۔ لیکن بات ایک تھی۔ نوحہ، مرثیہ، دکھائی ہوئی، کُنائی ہوئی آرزوؤں کے ننگے مزار۔ ہر ہنسی کے پیچھے۔ ہر تبسم کے پیچھے۔ ہر انداز گفتگو کے مرکز میں گویا اپنا سینہ کھولے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ لو۔ جاہل وحشی

ظالم درندو - ہمیں جھنجھوڑ کر کھا جانے والو' دیوتا نما شیطانو'
آہا - آہا - ہمیں قریب سے دیکھ لو......
کرشن چندر نے منہ پھیر لیا - باہر شفق کھل گئی تھی -
سبطے کے ذہین چہرے پر کرب کی اک لہر آئی - اس نے
آہستہ سے کہا - وہ دیکھا تم نے.......
سبطے کے چہرے پر کرب کی بیشمار لکیریں ہیں - جیسے سمندر
کا جھاگ ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر بجتہ ہو جاتا ہے - اسی طرح
ذہنی احساسات کا تموج سالہا سال سے اس کے نازک
چہرے پر یخ لبستہ ہوتا چلا گیا ہے - اس کا چہرہ خفیف سے
خفیف انسانی جذبات کا بھی عکاس ہے - اور اکثر ایسا معلوم
ہوتا ہے - گویا سبطے نے زندگی سے کرب ہی اخذ کیا ہے - زندگی
کی بے پناہ صعوبتوں اور گہری سے گہری مسرتوں سے بھی اُس نے
کرب ہی حاصل کیا ہے - غالباً اس کے انداز فکر میں اک ایسی نازکی ہے اور
اس کے احساسات اور جذبات پر اک ایسی شدت کی کیفیت ہے جو اُسے ہر غم سے
اور ہر مسرت سے اک خاص قسم کا درد محسوس کراتی ہے اک حسین کلی کو دیکھکر اس کے چہرے پر ایسی ہی کیفیت

پیدا ہوئی ہے۔ جیسے ایک نکبت زدہ بھکاری کو دیکھ کے۔
اس کا چہرہ شدّت احساس کا وہ مرکز اتصال ہے۔ جہاں حسن
اور غربت، دونوں ایک ہی درد کی تفسیر بن جاتے ہیں۔ اپنی
جوان سالی کے باوجود یہ چہرہ بوڑھا ہو چلا ہے۔ اس میں صدیوں
کی پختگی آ چلی ہے۔ کرب کی ننھی ننھی لاکھوں لکیریں اس چہرے
کے ہر روزن سے شب در روز جھانکتی نظر آتی ہیں۔ جیسے
انہوں نے دنیا کے سارے غم کا احاطہ کر لیا
ہو۔

شفق کے نازک رنگوں کو سیتے کے چہرے پر دہی مخصوص
کربناک کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا: "وہ
دیکھو ـــــ وہ دیکھو۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کرشن چندر نے شفق کی طرف دیکھا۔ اُفق پر پھولی ہوئی
سرسوں کی کیاریاں، کشمیر کی کشت ہائے زعفران۔ اُسے
بھی شفق بے حد پسند ہے۔ شفق جو اس کے دل میں نہ تھی
یہ پیلا پیلا سنہرا جادو جو اس کی روح میں نہ تھا۔ یہ

شادابی - یہ رنگینی - یہ حُسن کاری جس کے نہ ہونے سے اُس کا رُواں رُواں بھوکا تھا........ یہ شفق جواب سونا نہ تھی - جواب زعفرانی بھی نہ تھی - جواب گل مہر کے پھولوں کیطرح شعلہ بداماں تھی - سورج نیچے ڈھل گیا تھا - بادلوں کا ہر غرفہ پھول پھول تھا -

سبطے نے کہا - " وہ دیکھو........ وہ دیکھو......

سیاہ بادلوں کے پیچھے سونا ابل رہا تھا - سیاہ بادلوں کے مرکز میں آسمان نیلا تھا - ایک کھڑکی سی کھلی تھی - سمندر پہ کھڑکی کھل گئی تھی - اور سورج غروب ہو رہا تھا - اور وہ کھڑکی میں بیٹھ کر ڈوبتے ہوئے سورج کو تک رہا تھا - اور لہریں ریت کو چوم کر واپس چلی جا رہی تھیں - یہ نور کی لہریں یہ سورج کا سمندر - یہ خدائی کا مرکز

وہ دیکھو........ وہ دیکھو

شام بڑھنے لگی - شفق ڈوبنے گئے - تاریکی پھیلنے لگی - ہر چیز ڈوب جاتی ہے - اس تاریکی کے سمندر میں - وہ سنہرا

رنگ میں کھو گیا۔ وہ گلابی تاج محل شہابی ہو گئے۔ مرمریں سے گلابی، گلابی سے شہابی، شہابی سے قرمزی، محل ہاتھی بن گئے اور پھر تاریکی ——— نور کی آخری لہر افق سے ٹکرا کر ڈوب گئی اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ اب کچھ نظر نہیں آتا۔ سبطے نے افسردگی سے کہا۔ "اور اسے ڈائننگ کار یاد آئی" اگلے اسٹیشن پر وہاں چلیں گے۔"

اب کچھ نظر نہیں آتا" کرشن چندر نے کہا۔ بجلی کے کھمبے اور ہرے بھرے کھیت، اور پھوس کے جھونپڑے اور دھرتی کے بیٹے اور بیٹیاں..........

"عورت کا ذکر تم ضرور کرو گے" سردار نے چڑ کر کہا "میاں کسی ڈاکٹر سے علاج کراؤ اپنا۔ شفق کو دیکھ کر تمہیں عورت ہی یاد آتی ہے۔ اس خونیں منظر کو دیکھ کر بھلا تمہیں میدان جنگ کیوں یاد نہیں آتا........

گاڑی دھیمی ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ چلتی چلتی رک گئی سردار سبطے اور کرشن چندر اتر کر

ڈائننگ کار میں بیٹھ گئے

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

ڈائننگ کار میں خوبصورت فانوس تھے، شفاف بلوری میزیں تھیں۔ انگریزی شراب تھی، ہنستے ہوئے چہرے تھے، اور عورتیں جن کے چہرے گلاب تھے۔ تدلوٹا۔ ہنسی نقرئی، اور جسم بزناب، خون کے لباس کا سرسراتا ہوا ریشم اپنے رنگ و نور سے نگاہوں کو خیرہ کئے دیتا تھا۔ اور وہ بیٹھی ہوئیں اور مسکراتی ہوئیں اور ٹہلتی ہوئیں اس طرح دکھائی دیتی تھیں گویا کسی شیشے کی صراحی میں رنگین مچھلیاں تیر رہی ہوں۔ یہ ڈائننگ کار کی مچھلیاں تھیں۔ یہ وہ مچھلیاں نہ تھیں جو ساحل سمندر پر گھومنے والی ماہی گیروں کی میراث ہوتی ہیں۔

سبطے سردار اور کرشن چندر کو معلوم ہوا۔ گویا وہ کسی نئی
دنیا میں آ گئے ہیں۔ بیرا سپید مکلف لباس پہنے مؤدب
کھڑے تھے۔ تین کورس کا انگریزی کھانا۔ اس کے بعد کافی
پھر وہ لوگ اخروٹ کھانے لگے۔ صاحب لوگ اخروٹ
توڑنے والا ہتھوڑا استعمال کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے
اپنے دانتوں سے وہی کام لیا۔ مقابل کے مُنھ پر
تین انگریز فوجی بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے سے شناسا
نہ تھے۔ اس لئے بات نہ کر سکتے تھے۔ ہاں وہ ان قہقہہ مار
کر ہنسنے والے ادیبوں کی بدتمیزیوں کو بڑی حیرت سے
دیکھ رہے تھے۔ ان تین انگریز فوجیوں کے ساتھ چوتھی
کُرسی پر ایک موٹا پارسی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بار بار
کہہ اُٹھتا۔ میں پریشان ہوں۔ میں بے حد پریشان ہوں
جیلانی!

ٹھیک ہے۔ ایک انگریز فوجی افسر نے مسکرا کر کہا۔

نہیں تم نہیں جانتے۔ میں زندگی سے عاجز آگیا ہوں۔ بیرا ایک لارج برانڈی لاؤ۔ آپ بھی منگائیے

نو تھینکس، دوسرے فوجی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری مرضی۔ لیکن میں بہت پریشان ہوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں کس قدر پریشان ہوں۔"

فوجی افسر اُٹھ گئے۔ موٹے پارسی نے سیٹھے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ اور کہا "بھائی میں بہت پریشان ہوں۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔" سیٹھے نے مشورہ دیا۔

"کیسے پریشان نہ ہوں۔" میں تو پریشان ہوں۔ میں اس زندگی سے اس دنیا سے پریشان ہو چکا۔ یہ سب دھوکا ہے۔ سراب ہے۔" اس نے گلاس ختم کرتے ہوئے کہا۔

"بیرا ایک لارج برانڈی اور لاؤ۔ آپ پئیں گے؟"

"نہیں شکریہ!" کرشن چندر نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"آپ کی مرضی۔ مگر میں بہت پریشان ہوں!"

اتنے میں ایک موٹا پارسی آخری میز سے اُٹھ کر

ادھر آیا۔ دونوں پارسیوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا
بڑے ٹھوٹ سے "صاحب جی" کہا۔ اور وہ دونوں ایک
دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔

"کیا حال ہے؟" نووارد نے پوچھا۔

"کیا پوچھتے ہو دوست۔ یہ دنیا ایک دھوکا ہے۔
سراب ہے۔ مایا ہے۔ میں تو بے حد پریشان ہوں"

"آخر ہوا کیا ہے؟"

"ارے بھئی۔ امسال ایک کروڑ انکم ٹیکس میں جا رہا
ہے۔ اس سال کے بزنس پر۔ بتاؤ ہم لوگ کیا کمائیں گے۔
جب اسی فی صدی تو سرکار ہی منافع میں سے لے جائیگی
I tell you: it is a swindle میں بہت پریشان ہوں
کہیں بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ بوائے دو لارج برانڈی
لاؤ"

اتنا کہہ کر وہ موٹا پارسی میز پر سر ٹیک کر رونے لگا

حیدرآباد اسٹیشن

دوسرے روز صبح جب ہماری گاڑی نظام اسٹیٹ
کی حدود میں داخل ہو چکی تھی تو ایک اندھا لڑکا پاس
ہی کھڑکی سے دنیا کی بے ثباتی کا قصہ اپنی دلدوز آواز
میں گا گا کر بیان کر رہا تھا۔ باہر میلوں تک ننگے کھیت
تھے —— یا ٹیلوں تک
چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ خرگوش اور تیتر گاڑی
کی آواز سے چونک کر جھاڑیوں سے نکل بھاگتے تھے

پگڈنڈی پر چرواہا ریوڑ لئے جا رہا تھا۔ اور ریوں کے پاؤں سے اڑتی ہوئی گرد میں سورج کی کرنیں ایک زریں دھندلکے میں کھوئی گئی تھیں، یہی دھندلکا افق پر بھی تھا۔ جہاں سورج سرخ لحاف سے سر نکال کر نئے دن کو دیکھ رہا تھا۔ چلتی ہوئی گاڑی کو دیکھا تھا۔ ترقی پسند ادیبوں کے تھکے ہوئے چہرے دیکھ رہا تھا۔ کھجری کا نغمہ سُن رہا تھا جو مچلتی ہوئی زندگی کو برفیلی موت کا پیغام دے رہی تھی۔ مسافر آنے والی موت سے مرعوب ہو کر اندھے کو خیرات بانٹ رہے تھے۔ ہزاروں سالوں سے یہی آسا کی دھن اور یہی موت کا نغمہ صبح سویرے سارے ہندوستان میں گونج اٹھتا ہے۔ چھوڑ دو دنیا۔ چار دن کی چاندنی ہے۔ پھر اندھیری رات ہے۔ مایا کا جنجال ہے۔ مسافر کس بھول میں پڑا ہے۔ ان گنبدوں میں سراب ہے۔ اندھیرا ہے۔ تاریکی ہے۔ موت ہے۔ زندگی نہیں۔ حرکت نہیں۔ خوشی نہیں۔ خود اعتمادی کی وہ جگمگاتی ہوئی کرن نہیں جو

انسان کو صبح سے شام تک دنیا کے تکلیف دہ کاموں میں بہ مسرت وشادمانی مصروف رکھتی ہے۔ اسی لئے تو یہاں ہر فرد فاقہ مست ہے۔ ہر شخص کا چہرہ گھٹتا ہے۔ جیسے ابھی ابھی اس نے اپنے والد کے انتقال کی خبر سنی ہو۔ اسی لئے یہاں ہنسی ہونٹوں سے غائب ہے۔ کرۂ ارض پر شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں ہنسنا بدتمیزی میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور رونا عین ثواب ہے۔ رونا ہمارے نغمے میں ہے، ہمارے فلسفے میں ہے، ہمارے سماج میں ہے، ہمارے فن میں ہے، ہمارے مذہب میں ہے۔ رونا ہمارے تمدن کی معراج کمال ہے۔ سب ٹھاٹ پڑا رہ جائیگا ... ا... کھجری والے اندھے نے دوسرا رونا شروع کردیا۔ اور سردار نے جھلا کر اُسے دُوَنی دی اور کہا۔ "بس کرو اور اگر ضروری کچھ گانا چاہتے ہو تو کوئی کام کی چیز گاؤ۔ اندھا بےچارہ چند لمحے چپ رہا۔ اُس کے ساتھی نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اندازہ لگایا۔ کہ ڈبے میں مسلمان مسافروں

کی تعداد زیادہ ہے۔ اُس نے اندھے کے کان میں کچھ کہا اور اندھے نے کھجری کی تھاپ سے ایک نعت شروع کی۔ اور جب وہ نعت گا چکا۔ اور صرف مسلمان مسافروں سے پیسے وصول کر چکا۔ تو اُس نے اب دوسری چیز شروع کی مُرلی والے گھنشام ...... اب کے صرف ہندو مسافروں نے اُسے پیسے دیئے۔ اس وقت گاڑی میں بیٹھا ہوا ہر ہندو اور مسلمان مسافر ایک دوسرے کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے اُسے کچا کھا جائے گا۔ اور کرشن چندر کو ایسا محسوس ہوا گویا گاڑی کے ڈبے میں اک گہری خلیج حائل ہوتی جا رہی ہے۔ دو قوموں کے درمیان، دو نظریوں کے درمیان، دو زندگیوں کے درمیان، جیسے کوئی سویا ہوا احساس نفرت یکایک بیدار ہو گیا تھا اور سانپ کے پھن کی طرح سر اٹھا کر لوگوں کے دلوں میں لہرا رہا تھا۔ ہر چہرہ زہریلا تھا اور کمینہ اور بھوکا۔ جیسے وہ لوگ اپنی زندگی کی تمامتر صعوبتوں۔ ناکامیوں اور نامرادیوں کے ذمہ دار مخالف

فریق کو ٹھہرانا چاہتے تھے۔ اور اپنی بھوک اور پستی اور کمزوری اور نامرادی کا انتقام اُس سے لینا چاہتے تھے۔ یکایک گاڑی رک گئی۔ اور اندھا اتر کر دوسرے ڈبے میں چلا گیا۔ وہاں سے پھر وہی صدا آنے لگی۔ سب ٹھاٹ پڑا رہ جائیگا ...... کملی والے ..... مُرلی والے گھنشیام ...... اور کیفی اعظمی نے اس طرح برا سا منہ بنایا، جیسے کسی نے زبردستی اس کے گلے میں زہر انڈیل دیا ہو۔

مدن گوپال نے سر ہلا کے کہا "ظالم نے کیسا اچھا گلا پایا ہے"

"ہا ئیں!" یکایک سب ترقی پسند ادیب جھلا کے اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اگر اُن کا بس چلتا تو وہ اُسے اسی وقت گاڑی سے نیچے اتار دیتے۔ لیکن پھر یہ سوچ کے چپ ہو رہے۔ کہ اس آدمی نے منشی پریم چند پر ایک کتاب لکھی ہے۔

ہر طرف بیزار سے چہرے تھے۔ عادل رشید کھٹے

ڈکار لے رہے تھے ۔ ملک راج آنند مُنہ بہ ہات دکھے شریفانہ انداز میں جمائیاں لے رہے تھے ۔ مہندر ناتھ اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کھجا رہے تھے ۔ رفعت سروش بے وجہ مسکرا رہے تھے کرشن چندر پائنچوں میں دونوں ہات ڈالے سیٹ پر اکڑوں بیٹھا تھا ۔ قدوس اپنے حلق میں پولکیلٹس کی گولی رکھ رہے تھے ۔ سبطے آنکھیں مل رہے تھے ۔ اور سجاد اونگھ رہے تھے ۔ اور علی سردار جعفری لوٹا لئے پائخانہ روم کی طرف اس طرح بڑھ رہے تھے گویا کسی انقلابی مہم پر روانہ ہو رہے ہوں ۔

"مسلم چائے ۔ مسلم چائے" کسی نے پکارا ۔

یہاں بہت سے لوگوں نے ایک ساتھ کہا ۔ "لاؤ"

"کتنی چائے ؟"

"پندرہ بیس پچیس ۔ چالیس ۔ جتنی بھی ہو لے آؤ"

عادل رشید نے حکم دیا ۔

"چائے والے نے کہا ۔ " اگلے سٹیشن پر ملے گی"

اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا

اگلا سٹیشن بیگم پیٹ تھا۔ اور جب تک یہ لوگ چائے ختم کرتے حیدر آباد کا سٹیشن آگیا۔ یہاں استقبالیہ کمیٹی کے دس پندرہ ارکان حاضر تھے، اور صبح سویرے یوں چلے آنے پر برافروختہ سے دکھائی دیتے تھے۔ اُن کے چہرے خوش آمدید کہنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ مگر بشرے سے عیاں ہوتا تھا۔ میاں، اگر انسان ہو تو ابھی واپس لوٹ جاؤ۔ صبح سویرے ہمیں جگا دیا۔ یہ کوئی شرافت نہیں ہے۔ بھاڑ میں جائے تمہاری ترقی پسندی۔ یہاں حیدر آباد میں ہم لوگ دس بجے سے پہلے نہیں اٹھتے۔ دکانوں کے دروازے گیارہ بجے کھلتے ہیں۔ اور بارہ بجے کے قریب کہیں کوئی اکا دکا خریدار سردی میں ٹھٹھرتا ہوا۔ شیروانی کے

بٹن کالر تک بند کئے اک معذرتی انداز میں گھومتا ہوا نظر آتا ہے اور ایک آپ ڈھیٹ ہیں۔ کہ نو بجے ہی سٹیشن پر آ دھمکے ہیں۔ لعنت!

چند لمحوں تک مہمانوں نے میزبانوں اور میزبانوں نے مہمانوں کو دیکھا۔ پھر ہونٹوں پر تبسم آنے لگے۔ یہ تبسم بھی خوب ہے۔ کاروباری۔ تجارتی۔ معذرتی، احمقانہ، ہر طرح کا تبسم ہوتا ہے۔ مایوس تبسم، عیار تبسم، محبوب تبسم، مشفق تبسم۔ جاہل تبسم۔ عالم تبسم جیسے ہم سب کچھ جانتے ہیں اور آپ نرے چغد ہیں۔ کامراں تبسم، جیسے میاں بتاؤ اب کیا کرو گے تمہاری لونڈیا تو ہم لے اڑے۔ اور تبسم جس میں حسرتوں کی خاک بھری ہوتی ہے۔ ابراہیم جلیس کے چہرے پر بھی تبسم تھا۔ کچھ عجیب قسم کا، ملتجیانہ، مثبت یا لا مایوس تبسم۔ گویا کہہ رہا ہے۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا اس پر ایک فٹ کی اونچی رولی ٹوپی پہن کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ابھی ابھی

کسی سرکس سے نکل بھاگے ہیں۔ یہ شہاب ہیں۔ پستہ قد
گندمی رنگ، گول چہرہ۔ سیدھا سادا۔ لیکن آنکھیں بے حد
ذہین۔ گویا کہہ رہی ہوں۔ ہم تمہیں پہچان گئے۔ ایک ہی
ملے ہیں۔ یہ نظر حیدرآبادی ہیں۔ چوڑا سیاہ چہرہ۔
چوڑا ماتھا۔ چوڑا دہانہ۔ بڑے بڑے الجھے ہوئے بال
ہر چیز میں وسعت کا احساس۔ دکن کا مثالی باشندہ، جیسے
دکن نے خود اپنی وسیع وعریض چٹانوں سے تراشا ہو۔ بیباک
قہقہہ۔ بے جھجک تبسّم جو خود بخود لبوں پر آیا جاتا ہے۔ نظر
شاعر ہوکر بھی زمین کے اس قدر قریب کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا
اندازہ اُسے دیکھ کے ہی ہو سکتا ہے۔ یہ مسلم ضیائی.....
پستہ قد۔ سنولا رنگ، گنجا سر۔ آنکھوں پر دبیز شیشے، ہونٹوں
پر شرمیلی کنواریوں کی سی مسکراہٹ، مسکراہٹ جو کھو جاتی
تھی اور آجاتی تھی۔ پیچھے ہٹ جاتی تھی۔ اور سامنے آجاتی
تھی اس قدر احساس مسکراہٹ تھی وہ کہ فیصلہ ہی نہ کر سکتی تھی
یہ باہر کے لوگ میرے دوست ہیں یا دشمن۔ اجنبی ہیں یا عزیز

مسکراہٹ جو کہہ رہی تھی۔ میں اکیلی ہوں۔ میں تنہا ہوں۔ میں نے بہت کچھ کھو دیا ہے۔ سب کچھ کھو دیا ہے۔ پھر بھی میں معصوم ہوں اکیلی ہوں۔ مجھے نہ چھوڑو۔ میں تمھیں اپنا بنانا چاہتی ہوں۔ لیکن مجھے تم پر اعتبار نہیں۔ اپنے آپ پر اعتبار نہیں۔ اس ذلیل ماحول پر اعتبار نہیں۔ جو آدمی کو آدمی نہیں رہنے دیتا۔ تم میرے رفیق ہو سکتے ہو۔ ہاں۔ ہاں .... نہیں نہیں ...... مجھے چھوؤ نہیں۔ میرے پاس اب اپنا کچھ نہیں۔ ..... ایک نام تھا وہ بھی اپنا نہیں رہا۔ ضیائی میرا ایک دوست تھا۔ وہ مر گیا۔ اُس کا نام میں نے اپنا لیا۔ اب وہ مجھ میں زندہ ہے۔ تم میری ہنسی اڑانا چاہتے ہو۔ اُلو میں چلی نہیں تم مجھے نہیں سمجھو گے۔ اس دوست نے مرتے وقت مجھ سے کہا تھا۔ کہ میں شراب نہ پیوں۔ اُس دن سے میں نے کبھی شراب نہیں .... تم پھر ہنسنے لگے۔ الو میں ہونٹوں سے غائب ہوتی جا رہی ہوں..... تم مجھے نہیں سمجھو گے۔ میں جو معصومیت کی میراث ہوں۔ میں جو محبت کے آنسو سے پیدا ہوتی ہوں

اور ناکامی کی گود میں موٹی بن کر چھپی رہتی ہوں۔ ....

مسلم ضیائی اور مہندر ناتھ گلے ملنے لگے۔

" آپ سے ملئے " کسی نے کرشن چندر سے کہا۔ اور کرشن چندر نے مڑ کر دیکھا۔ معمولی قد و قامت کا بے ڈول سا انسان۔ چہرے پر اک لایعنی۔ بے مطلب تبسم۔ پُر اسرار تبسم نہیں کہ جسے آدمی نہ سمجھ سکے۔ بلکہ ایسا تبسم جو اپنی تفسیر ہی کسی طرح اسم مہمل نہ پڑھ سکے۔ بے حد روکھا پھیکا چہرہ، نہ لبوں پر چمک نہ آنکھوں میں ذہانت نہ پیشانی پر نور۔ چپ چاپ گم سم۔ مٹی کا مادھو۔ چہرے کا رنگ پیلا، نہیں مٹیالا۔ نہیں خاکستری۔ نہیں کچھ خاکستری کچھ سبز سا۔ بالکل مینڈک ایسا۔ لاحول ولا۔ کرشن چندر نے دل ہی دل میں کہا۔ اُسے دیکھ دیکھ کر متلی سی ہو رہی تھی.... کس کا منہ دیکھنا پڑا صبح سویرے ....

" آپ جگر حیدر آبادی ہیں۔ ابراہیم جلیس کے بڑے بھائی ہیں "

"اوہ جگر حیدرآبادی ہیں؟ بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر" کرشن چندر نے مصافحہ کرتے ہوئے اپنے غلیظ کثیف دانتوں کی نمایش کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر مڑ کر سبطے کے کان میں۔ "جگر جہاں بھی دیکھو۔ جلا بھنا ہی ملتا ہے کمبخت!"

سبطے نے ہنس کر کہا۔ "ہاں حیدرآباد میں ہو یا مرادآباد میں یا اردو شاعری میں۔ اس کا ایک ہی رنگ ہے"

سردار نے سبطے اور کرشن چندر دونوں کو ڈانٹا۔ "آئینے میں اپنی صورتیں ملاحظہ فرمائیے ذرا۔ پھر دوسرے پر انگلی اٹھائیے گا۔

"کچھ بھی ہو مجھے تو اس شخص سے نفرت ہوگئی ہے۔" کرشن چندر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"یہ آپ کی بدقسمتی ہے۔ کیونکہ قیام و طعام کے تمام انتظامات جگر صاحب کے ذمہ ہیں" سردار نے ہر لفظ پر زور دے کے کہا۔

"باپ رے" کرشن چندر چونک کر اچھل پڑا۔

حیدر گوڑہ

جس مکان میں مہمان ادیبوں کو ٹھہرایا گیا۔ وہ حیدر گوڑے
میں واقع تھا۔ علی سردار جعفری نے کرشن چندر کو حیدر گوڑہ
جاتے راستے میں ایک محل کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ گذشتہ
مرتبہ اردو کانگریس کے موقعہ پہ ہم لوگ اُسی محل میں ٹھہرائے
گئے تھے۔ قیام و طعام کا اس قدر اچھا انتظام۔ بلکہ ضرورت
سے کچھ زیادہ ہی اچھا تھا۔ ہر مہمان کے لئے دو نوکر وقف
کئے گئے تھے۔ جو ہر وقت اس کے کمرے کے باہر بیٹھے

رہتے تھے۔ اُس وقت کے نظم و نسق میں جاگیرداری کا مکمل شکوہ موجود تھا۔ اور کرشن چندر نے سوچا اب پرو مغاربیت کی حد ہوگئی ہے۔ دراصل اُسے جگر سے بغض للّٰہی ہوگیا تھا۔ اس لئے اسے یہ مکان بھی پسند نہ آیا۔ درحالیکہ مکان نیا نیا تعمیر کیا گیا تھا۔ اور پورا مکان ان لوگوں کے قبضے میں تھا۔ کرشن چندر نے دل ہی دل میں مہتمم کو گالیاں دیتے ہوئے سب سے اچھا کمرہ اپنے قبضے میں کر لیا۔ باقی تین کمروں میں چھ چھ سات سات آدمی کولیاں بنا کے بس گئے۔ اور بستر فرش پر بچھ گئے۔ اونہہ۔ چارپائی تک تو میسر نہیں۔ اور یہ باتھ روم کی کنڈی بھی غائب ہے۔ اور نہانے کے لئے برتن بھی موجود نہیں۔ جگر اس کے ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے۔ اور اُس کے دل کی وحشت بڑھتی جارہی تھی۔ یکایک اُس نے رُک کر جگر صاحب کو مخاطب کیا " بہت اچھا مکان لیا ہے آپ نے "

" جی صاحب۔ ابھی ابھی بنا ہے " جگر معصومیت سے

فرمانے لگے۔ " وہ دیتا نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اسے حاصل کیا۔ آپ لوگوں کے لئے۔ بالکل نیا ہے۔ ڈپٹی جلال الدین جو ہیں نا.......

کرشن چندر نے دل میں کہا: "اب آپ اس مکان کی کہانی سنائیں گے۔ اس کا شجرہ نسب بیان کریں گے۔ ٹھیک ہے صاحب!" "آپ کہئے۔ ہم سنیں گے۔ آپ کے مہمان جو ٹھہرے"

اتنے میں ایک آدمی دوڑتا ہوا۔ " جگر صاحب سجاد ظہیر صاحب پلنگ مانگ رہے ہیں۔ اُن کے کمرے میں پلنگ ڈلوا دیجئے۔"

جگر صاحب نے کہا۔" پلنگ تو یہاں نہیں ہیں، مگر ٹھہریئے میں انتظام کرتا ہوں۔" اتنا کہہ کے وہ اپنی کہانی ادھوری چھوڑ کے چل دیئے۔ اور کرشن چندر نے سوچا۔ کس قدر عجیب آدمی ہے یہ۔ بھئی تم اپنی کہانی تو پوری کرتے جاؤ۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کہ عین گفتگو کے بیچ میں اُٹھ کے چل دیئے۔ کس قدر بُری بات ہے یہ۔ اچھی تہذیب ہے یہ۔

واہ - پھر اُسے سجاد ظہیر کے پلنگ کا خیال آیا - بنے پلنگ ہی پہ سو سکتے ہیں - فرش پر نہیں آخر اُن کے لئے پلنگ کیوں منگایا جائے - وہ کیوں پلنگ پر سوئیں اور ہم کیوں نہ پلنگ پر سوئیں - واہ - یہ اچھی رہی - کرشن چندر نے سوچا - بنّے (سجّاد) پلنگ پر سوئیں گے - تو میں بھی پلنگ پر سوؤں گا - بنّے کے لئے پلنگ آئے گا تو میرے لئے بھی آئے گا - میں کسی سے کم نہیں ہوں - اور یہ جگر صاحب کس صفائی سے مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کے بنے کیلئے پلنگ کا انتظام کرنے کے لئے چلے گئے - میں بھی تو ان کا مہمان ہوں - مہمان ہوں - خاک مہمان ہوں - گھنٹوں سے یہاں اس خالی کمرے میں کھڑا ہوں - کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے - اور بنے کے لئے پلنگ منگایا جا رہا ہے - اور میں یہاں فرش پر سوؤں گا - میرا ماتھا تو اسی وقت ٹھنکا تھا - جب میں نے جگر کو سٹیشن پر دیکھا تھا - خباثت اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے

پلنگ لانے گئے ہیں۔ سجاد ظہیر کے رشتہ دار ہوتے تو میں کیا میں یہاں فرش پر سوؤں گا۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ لیکن — لیکن۔ میں جب سے یہاں کھڑا ہوں۔ کوئی نوکر بھی تو اس کمرے میں جھاڑو دینے نہیں آیا۔ اور دوسرے کمروں میں پلنگ بچھائے جا رہے ہیں۔ کون پوچھتا ہے مجھے۔ میں کون ہوں جو مجھے کوئی پوچھے گا۔ دراصل یہ سب سازش ہے۔ مجھے ذلیل کرنے کے لئے یہاں بلایا ہے وہ بے چارہ احمد علی ٹھیک کہتا تھا۔ کرشن چندر کو اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ اور اس کی آنکھیں غم و غصے کے آنسوؤں سے غمناک ہوگئیں۔ اتنے میں مجلس استقبالیہ کے ایک رکن تشریف لائے۔

"چلئے۔ چائے پی لیجئے۔"

"نہیں۔ میں چائے نہیں پیوں گا" کرشن چندر نے کہا

"آپ چائے نہیں پیتے۔"

"پیتا ہوں۔ مگر اس وقت نہیں پیوں گا۔"

"کیوں کوئی خاص بات ہے؟"

"جی نہیں۔ مجھے ذرا —— بیچینی ہے۔"

"تو بیچینی میں تو چائے مفید ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہوگی۔ مگر میرے لئے نہیں۔"

"اچھا تو چلئے۔ تھوڑا سا ناشتہ ہی کر لیجئے۔"

"ناشتہ؟ میں ناشتہ بھی نہیں کروں گا۔"

"چلئے بھائی۔ تکلف نہ کیجئے۔ آپ ناشتہ نہیں کریں گے تو جگر صاحب مجھ پر خفا ہوں گے۔"

"جگر صاحب کہاں ہیں۔ انھیں میرے پاس بھیج دیجئے۔"

"وہ ابھی آتے ہوں گے۔ سجاد ظہیر کے لئے پلنگ کا انتظام کرنے گئے ہیں۔"

"نہیں صاحب۔" یکایک کرشن چندر نے چلّا کر کہا "مجھے بیچینی ہے۔ سر میں درد ہے، ہلکی ہلکی حرارت بھی ہے۔"

"بخار ہے۔ بیچینی ہے۔ سر میں درد ہے۔ تو ٹھہریئے میں ڈاکٹر کو بلا کے لاتا ہوں۔

کرشن چندر نے کہا۔ "ٹھہریئے، ٹھہریئے" مگر وہ رکا نہیں اور ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا۔

اتنے میں سردار قریب سے گزرا۔ "یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو۔ کرشن، چلو ناشتے پر لوگ تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ اور وہ دونوں بازو میں بازو ڈال کر چل دیئے ناشتے سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے کمرے کو گیا۔ تو کیا باہر وہلیز پر جگر کھڑے ہیں۔ اور اس کے کمرے میں پلنگ بچھوایا جا رہا ہے۔

جگر نے کہا۔ "ڈاکٹر ابھی آتا ہوگا۔ میں ابھی بستر کیئے دیتا ہوں۔ آپ اس پر آرام کیجئے۔"

اجلاس

کانفرنس کا پہلا اجلاس، افتتاح کے موقعہ پر سروجنی
نائیڈو صاحبہ کی شعلہ بیانی، کیا عورت ہے۔ معمر ہونے
پر بھی آنکھوں کی جواں سالی نہیں کھوئی، تبسّم کی حیرانی نہیں
کھوئی، روح کی جستجو اور پیہم کاوش نہیں کھوئی، بدلتا ہوا
زمانہ ہر بار اک نیا مرحلہ سامنے لے آتا ہے، اور یہ شاعرہ
اس مرحلے کا یوں استقبال کرتی ہے، گویا وہ مدت سے
اس کی منتظر تھی، اٹھتی ہوئی لہریں بار بار ساحل سے ٹکراتی

ہیں۔ اوران رواں دواں بلند و بالا موجوں کے تخت پر آپ اس عورت کو دیکھیں گے۔ جس نے ہندوستانی سیاست اور ادب کے سارے رنگ دیکھے ہیں۔ فن سے زندگی تک، اور ہوم رول سے اشتراکیت تک۔ وہ کبھی پیچھے نہیں رہی۔ اُس کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔ وہ زمانے سے ہمیشہ دو قدم آگے رہی ہے۔ ممکن ہے اپنے باغیانہ خیالات کی بنا پر اب کے اُسے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں بھی جگہ نہ ملے۔ سردار نے سبطے سے کہا۔ سُن سبطے نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے کہا۔ سنو کرشن۔ اپنا مقالہ پڑھنے جا رہا ہے ہال میں خاموشی تھی۔ پانچ ہزار آدمی چپ چاپ بیٹھے ہوئے ایک ادبی مقالہ سن رہے تھے۔ اس سے پہلے ایسا نہ ہوا تھا۔ یہاں مشاعرہ نہ تھا۔ خطیبانہ اندازِ تکلّم نہ تھا۔ کوئی گہری فلسفہ طرازی نہ تھی۔ لیکن لوگ خاموشی سے سن رہے تھے، پانچ ہزار آدمی، کالج کے طالب علم۔ سکول کی لڑکیاں، سرکاری ملازم، دکاندار، ریلوے کے مزدور،

ہلے کار۔ ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ اور خاموشی سے سُن
رہے تھے۔ اور جب مقالہ نگار نے مراکو سے لے کے جاوا
تک کے آزادی پسندوں کی تحریک کا ذکر کیا۔ تو ہال نعروں
سے گونج اٹھا۔ اور جب ادب میں اشتراکیت کا ذکر آیا۔ انسانیت
کا ذکر آیا۔ ایک بہتر نظام زندگی کا ذکر آیا۔ عشق کی انقلابی
ماہیت کا ذکر آیا۔ اور اُن طبقوں کا ذکر آیا جن پہ ہمارے
ادب کے دروازے ابھی تک بند ہیں۔ تو سامعین کے دلوں
کے تار جھنجھنا اٹھے۔ جیسے مقالہ نگار کی زبان اور اُن کے
دل ہل گئے تھے۔ جیسے اُس مقالے میں وہ لوگ خود بول
رہے تھے۔ پہلے روز بھی یہ ہوا۔ دوسرے روز بھی اسی
طرح ہوا۔ تیسرے اور چوتھے روز بھی یہی ہوا۔ یہ مکمل
انہماک، یہ سچائی کو پا لینے کی پاکیزہ جستجو ہر چہرے سے
عیاں نظر آئی۔ گذشتہ دس سال سے لوگ تہذیبی اور
ادبی کاوشوں کی طرف توجہ دینے لگے ہیں۔ انھیں اپنی قومی
زندگی کا عنصر سمجھنے لگے ہیں۔ اور گو تعمیری تنقید نے اتنی ترقی

ہ کی تھی۔ پھر بھی باشعور پڑھے لکھے طبقے میں ان ہی باتوں کا چرچا تھا۔ نئی تحریروں پر بحثیں ہوتی تھیں۔ بہ نظر تعمق نگاہ ہر مضمون کے حسن و قبح پر، اس کے افادی یا غیر افادی پہلوؤں پر۔ اس کے ترقی پسند یا ناترقی پسند رجحانات پر بڑی تفصیل سے گفتگو ہوتی تھی۔ مختلف نظریے تھے، مختلف اذہان تھے۔ مختلف زاویہ ہائے نگاہ۔ لیکن ایک چیز ان سب میں وجہ اشتراک تھی۔ ادب اور کلچر اور تمدن سے دلچسپی۔ حقیقی دلچسپی، اور قومی اور ملکی ادب کو اس راہ پر گامزن کرنے کی آرزو جہاں وہ اس کی بڑھتی اٹھتی، مچلتی ہوئی زندگی کا ترجمان بن جائے۔ ہندوستان کے نوجوان کا دل جاگ اٹھا تھا۔ اور ادب کی ہر تفسیر میں اپنی تمناؤں کے فانوس خیال روشن کر رہا تھا۔ یہ روشنی جو بڑھتی جا رہی تھی، جو اندھیرے پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ گیت جس کے ہر مصرعے میں اک نئی لے کی چمک تھی۔ اور جس کی ہر لے میں کروڑوں انسانوں کی آرزوؤں کی گونج تھی۔ اس

نئے نغمے نے ہر ادیب کے دل کو بہجت اور مسرّت سے لبریز کر دیا اور اُن کے دلوں کی دھڑکنیں اُن ہزاروں دلوں کی دھڑکنوں میں کھو گئیں جو اُس وقت ہال میں موجود تھے۔ روشن چہرے۔ ذہین آنکھیں۔ تالیوں کا شور اور نئی زندگی، نیا ادب۔ نئے انقلاب کے نعرے، یکایک کئی ادیبوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ گویا سب کے دل معاً ہی شدت سے محسوس کرنے لگے کہ ادب صرف تخیل کی چار دیواری میں محبوس رہ کر کس قدر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور اس بڑھتی ہوئی زندگی۔ کشمکش حیات کی آویزشوں سے ٹکراتی ہوئی زندگی کے بحرانی لمحوں میں گھل مل کر ادب اور ادیب کیسے اک نئی وسعت، اک نئے رخ، اک نئے کیف و کم سے سرشار ہو جاتا ہے۔

پہلے اجلاس کے ختم ہونے کے بعد بہت رات گئے اجلاس کی کامیابی پر گفتگو ہوتی رہی۔ کالجوں کے لڑکے بڑے انہماک سے ادیبوں کی گفتگو سنتے رہے۔ اور آٹوگراف لیتے رہے۔ یہ آٹوگراف کی بدعت بھی خوب ہے۔ ادیب جلدی میں یوں دستخط کرتے تھے۔ گویا کہہ رہے ہوں۔ ارے بھئی۔ ان لوگوں نے تو پریشان کردیا۔ اب کوئی کہاں تک دستخط کرے۔ کبھی کبھی کسی لڑکی کی آٹوگراف بک آجاتی تو قلم لے کے بیٹھ جاتے۔ اور سوچتے کہ کس طرح ایک فقرے میں لیلیٰ و مجنوں کی پوری داستان بیان کردیں۔ بعض لوگ بہت ہی کلبی بننے کی کوشش کرتے۔ ایں۔ اس میں ہے کیا آخر۔ آخر تو عورت ہی تو ہے۔ شوپن ہار والی عورت، جا معاف کردیا تجھے مدن گوپال سے کسی نے آٹوگراف نہیں مانگا۔ تو آپ بتیسی نکالے ہر ایک سے پوچھ رہے ہیں۔ "بھئی، اس خوبصورت لڑکی کی بے حد بدصورت آٹوگراف بک پر تم نے کیا لکھا

ہی ہی ہی " اب کوئی پوچھے اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی۔ آٹوگراف بک جو مسلم ضیائی کے پاس تھی کئی اعتبار سے بہت دلچسپ تھی۔ سجاد ظہیر نے لکھا تھا۔ "اشتراکیت زندہ باد" کرشن چندر نے لکھا تھا "انسانیت زندہ باد" جوش نے لکھا تھا: "ابھی تم دونوں بچے ہو" آگے ساغر نے لکھا تھا "تو بڑا چار سو بیس ہے" یہاں آ کے تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ اور جوش و ساغر کے مناقشات پر گفتگو ہونے لگی۔ جوش کی رباعیوں کا ذکر آیا۔ فراق نے بھی رباعیاں کہنا شروع کی تھیں۔ موازنہ ہوا۔ اسی جھگڑے میں رات کے دو بج گئے۔ صبح ہی سردار کو نظام کالج میں ایک تقریر کرنا تھی۔ اُس نے سوچا۔ لاؤ ابھی شیو کر ڈالو۔ کرشن تمھارا شیو کا سامان کہاں ہے۔ کرشن کا سامان غائب تھا۔ اُس نے بہت ڈھونڈا۔ لیکن کہیں نہ ملا۔ اس نے گھور کر جگر صاحب کی طرف دیکھا۔ جگر نے کوئی توجہ نہ کی۔ کرشن چندر کے دل میں نفرت اور بڑھ گئی۔ خوب

اب یہ پوچھنے تک بھی نہیں کہ بھئی آپ کا شیو کا سامان کہاں ہے۔ کیسے گم ہوا۔ یہیں کہیں ہوگا۔ میں ڈھونڈوا دیتا ہوں۔ جگر نے جمائی لے کے کہا ”میں تو چلتا ہوں۔ صبح فراق اور احتشام اور ڈاکٹر عبدالعلیم تشریف لائیں گے!! اور ہمیں تو نظام کالج جانا ہے“۔ کرشن چندر نے کہا۔ گاڑی کا انتظام کر دیجئے۔“ میں دیکھتا ہوں“۔ جگر نے سرسری طور پر کہا۔ اور کرشن چندر کا جی جل کے کباب ہوگیا۔ اور وہ اسی لمحے اپنے کمرے میں جا کے بستر پر دراز ہوگیا۔ اور اس نے سوچا۔ میں کل صبح نظام کالج نہیں جاؤں گا۔ چاہے مجھے کوئی کچھ ہی کہے۔ میری بلا سے“۔ وہ صبح اٹھا تو شیو کا سامان غائب ہی تھا۔ دوبارہ ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملا۔ سردار بے چارہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے گھوم رہا تھا۔ لیکن کسی کا شیو کا سامان خالی نہ تھا۔ آنند ڈاڑھی مونڈ رہے تھے۔ سبطے نیند میں کراہ رہا تھا۔ سجاد ظہیر اپنے شیو کا سامان کسی کو مستعار نہیں

دیتے۔ قدوس صہبائی نے جب دونوں کو نظام کالج کا عزم کرتے دیکھا۔ تو بولے۔ "آپ شیو بنا لیتے تو اچھا تھا سنا ہے نظام کالج میں لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں"۔ سردار کا چہرہ تنا ہوا گھونسا تھا۔ اور کرشن چندر کا چہرہ ایک بھولی بھیڑ کا۔ اتنے میں جگر گاڑی لے آئے۔ چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری۔ نہ غم۔ نہ حسرت۔ نہ حیرانی۔ نہ دلچسپی۔ نہ وہ ادیبوں سے مرعوب تھے۔ نہ اُن سے بیزار نظر آتے تھے۔ جیسے کوئی خاص دلچسپی انھیں ان لوگوں سے نہ تھی۔ اور پھر کوئی ایسی اجنبیت بھی نہ تھی۔ کچھ عجب قسم کی لاتعلقی چہرے پر عیاں تھی۔ جسے دیکھ کر کرشن چندر اور بھی جھنجھلا گیا۔ اور اپنے چہرے کے بڑھے ہوئے بالوں پر یوں ہات پھیرنے لگا گویا جگر ہی نے اُس کے شیو کا سامان گم کیا تھا۔

جب سردار اور کرشن چندر نظام کالج سے لوٹے تو فراق اور احتشام اور ڈاکٹر عبدالعلیم لکھنؤ سے تشریف

لے آئے تھے۔ یہ سب لوگ کھانے پہ بیٹھے عریانی پر
بحث کر رہے تھے۔ سردار نے آتے ہی قلم ہاتھ میں
لے کر ایک تجویز اس امر کے متعلق لکھنا شروع کی۔ اور
بحث طویل ہوتی گئی۔ فراق حسن کار ہیں۔ اس لئے انھیں
عریانی سے اتنی نفرت نہیں۔ احتشام کی طبیعت میں نوجوانی
کے باوجود اتنا ٹھہراؤ ہے کہ وہ عریانی کو دیکھ کر بدکتے
نہیں۔ برافروختہ نہیں ہو جاتے۔ صلواتیں سنانے پر آمادہ
نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کا انداز یہ تھا۔ میاں ابھی تم
بچے ہو۔ کیا طفلانہ باتیں کر رہے ہو۔ ان کے ہنس مکھ
بشاش چہرے پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ دوڑ کے گم ہو جاتی
تھی۔ وہ اپنی داڑھی اور وضع قطع سے فرانسیسی معلوم
ہوتے ہیں۔ اور اپنے درشت انداز تکلم سے ہیڈ ماسٹر،
اور آگ بگولہ ہوتے وقت سو فیصدی کمیونسٹ نظر آتے
ہیں۔ اکثر لوگ غلط بات غلط موقع پر کہتے ہیں۔ یا غلط
بات صحیح موقعہ پر کہتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر عبدالعلیم کے

متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ صحیح بات کہتے ہیں اور ہمیشہ غلط موقعے پر کہتے ہیں۔ حیدرگھاٹ کالج میں انھوں نے چار روزہ تقریر کرتے ہوئے طلبا کے مجمع میں کالج کے استادوں کو وہ ڈانٹ بتائی کہ بے چارے اب تک یاد کرتے ہوں گے۔ اسی طرح P.E.N کانفرنس کے موقع پر جب ڈاکٹر ملک راج آنند نے تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں بھی فرانسیسی انسائیکلو پیڈلیسٹ کی طرح ایک تحریک جاری کی جائے۔ تو بہت سے لوگوں نے اس انقلابی تجویز کی حمایت کی۔ ان میں ریاست بیکانیر کے وزیر سردار پانیکار بھی شامل تھے۔ لیکن صرف ایک آدمی کی پُرزور مخالفت سے یہ تحریک رہ گئی۔ یہ مخالفت کرنے والا جانتے ہو کون تھا۔ یہی اپنے ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب۔ آپ نے اٹھ کر کہا۔ تجویز تو بہت معقول ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ فرانس میں اس تحریک کے چلانے والوں میں بڑے بڑے لوگ تھے۔ روسو اور والٹیر۔ یہاں ایسا کون ادیب ہے

کون ایسا مفکر ہے۔ آپ نے پورے مجمع پر نظر ڈال کر کہا۔ مجھے تو آپ لوگوں میں سے ایک آدمی بھی اُس پائے کا نظر نہیں آتا۔ اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ پھر مجمع میں سے کسی من چلے نے کہا۔" اور کیا ڈایس پر بھی کوئی ایسا آدمی آپ کو نظر نہیں آتا۔"

ڈایس پر سروجنی نائیڈو تشریف فرما تھیں۔ جواہر لال نہرو تھے۔ .... فلسفہ دان رادھا کرشنن، ہرین ادلڈ اور........ فارسٹر۔ اور ملک راج آنند احمد شاہ بخاری پطرس۔ اور دوسرے لوگ۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈایس پر نگاہ ڈالی۔ سب کی طرف دیکھا۔ اور پھر مجمع کی طرف مڑ کر کہنے لگے۔" ہیں۔ اِن میں بھی کوئی نہیں...... !

تحریک گر گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ڈاکٹر صاحب سچائی کو اس شدت احساس کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اور

اُس پر اس سختی سے کاربند ہوتے ہیں۔ کہ اکثر اوقات ہمدرد بھی مخالف ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کی اُنھیں کوئی پروا نہیں وہ ادیبوں کے مہاتما گاندھی ہیں۔ لیکن ذرا عدم تشدد کے قائل نہیں۔ اور اگر کبھی ہندوستان میں ایسا قانون نافذ ہوا کہ ادیبوں کو ان کی نکری۔ ذہنی یا خارجی غلطیوں کی سزا ملنے لگی۔ تو اس احتساب کا محکمہ ڈاکٹر صاحب کے ہی سپرد ہوگا۔ اُن کی صاف گوئی سے بہت سے لوگ اُن سے گھبراتے ہیں۔ لیکن اس میں اُن کی عظمت ہے۔ اور اگر اس صنف میں کوئی اُن سے ٹکر لے سکتا ہے۔ تو وہ حسرت موہانی ہیں۔ جو خوش قسمتی سے اس کانفرنس میں تشریف رکھتے تھے۔ اور بلا ناغہ اس کے ہر جلسے میں شرکت کرتے رہے۔ چنانچہ جب ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے عریانی کے خلاف قرارداد پیش کی گئی۔ تو اس کی مخالفت کرنے والے مولانا حسرت موہانی تھے اور قاضی عبدالغفار۔ مزے کی بات یہ تھی۔ کہ نوجوان

عریانی کے خلاف تحریک پیش کر رہے تھے۔ اور بزرگ اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا۔ کہ اس طرح نوجوان اذہان کی قوتیں مسلوب ہو جائیں گی۔ اور ان کی تخیلی تموّرک جائے گی۔ مولانا حسرت موہانی کی پر زور تقریر سے قرارداد مسترد کر دی گئی سبطے بے حد ناخوش تھا۔ کہنے لگا۔ " اماں۔ مولینا کا ہمیشہ یہی رول رہا ہے۔ وہ جہاں گئے۔ لوگوں کو مصیبت میں ڈالتے گئے۔ جب کانگریس میں تھے۔ تو ہوم رول کے دنوں میں آزادی کا ذکر کر کے کانگریس ہائی کمانڈ کو خائف کیا کرتے تھے۔ اور جب کانگریس نے لاہور کانگریس کے موقع پر مکمل آزادی کی قرارداد منظور کر لی۔ تو آپ نے اشتراکیت کی پخ لگا دی۔ اور کانگریس سے ایسے ناخوش ہوئے کہ مسلم لیگ میں چلے گئے۔ وہاں پہنچے ہیں تو اب بے چارے شریف خان بہادروں کو بغاوت پر اکسا رہے ہیں۔ اور مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس

گئے دے رہے ہیں۔ ہر جگہ مصیبت میں ڈالتے ہیں یہ لوگوں کو۔ بھئی اب اچھا بھلا یہ ریزولیوشن پاس ہو رہا تھا..... خیر..... ہٹاؤ اب اس قصے کو۔" یہ کہہ کر وہ رک گیا اور اُس کے چہرے پر ہزاروں درد کی لکیریں یکایک معدوم ہو گئیں۔ اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ مگر بھئی۔ یہ خوب ہیں مولینا چٹان ہیں۔ بس کسی کی نہیں سنیں گے۔ اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہٹیں گے۔

دوپہر کو پریم چند سوسائٹی کا افتتاح تھا۔ حسین ساگر میں جو کلب ہے وہاں دعوت بھی تھی ادیبوں کو کشتیوں میں سوار کر کے کلب میں پہنچایا گیا۔ درحالیکہ ایک راستہ خشکی سے بھی جاتا تھا۔ غالباً موٹر بوٹ کی نمایش مقصود

تھی۔ کلب کی عمارت جھیل میں تعمیر کی گئی ہے۔ کوئی پچاس کے قریب ملازم ہوں گے۔ آٹھ کورس کا کھانا۔ اس دعوت پر اتنا صرف کیا گیا تھا کہ غالباً پریم چند اپنی زندگی میں اتنی رائیلٹی نہ لی ہوگی۔ یورپ میں جب ادیب زندہ ہوتا ہے تو اس کی قدر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں مرنے کے بعد اُسے پوچھا جاتا ہے۔ چنانچہ آج پریم چند سوسائٹی کا افتتاح تھا۔ قاضی عبدالغفار خان تقریر کر رہے تھے اور مرغن کھانے دعوت میں شامل تھے۔ اور جھیل کے منظر سے ادیب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ قاضی عبدالغفار خان کی شخصیت پر متانت کا ایک دبیز پردہ پڑا ہوا ہے لیکن اتنا دبیز بھی نہیں کہ ان کی جبلی خوش طبعی اس متانت کے اندر سے جھلک نہ اٹھے۔ متانت ہے لیکن بوجھل نہیں ہے۔ خوش طبعی ہے لیکن کھل کر نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کسی چیز نے، کسی خاص واقعے نے۔ یا کسی خاص ماحول نے، ان کے ذہن کے، ان کے

فکر کے ، ان کی فطری صلاحیت کے دو ٹکڑے کر دیتے ہیں ۔ وہ اس پر بھی مجبور ہیں ۔ اس پر بھی ۔ دونوں رنگ ایک ہی شخصیت میں جھلکتے نظر آتے ہیں ۔ پیرس کی رنگینی بھی ہے ۔ عالمانہ زہد بھی ہے ، شگفتہ انشا پردازی بھی ہے ، اور فکری ٹھراؤ بھی ۔ لباس میں امارت کی جھلک ہے اور گفتگو میں حلم کی چاشنی ۔ تیور جاگیردارانہ ہیں ۔ اور ذہن باغیانہ ، قاضی صاحب اک ایسے نوجوان ہیں جسے عرصے سے کسی نے گدگدایا نہ ہو لیکن خود اس کے دل میں شوخیاں چٹکیاں لے رہی ہوں ۔ کاش کوئی مصنفِ لیلےٰ کے خطوط کو گدگدا دے ۔ اس طرح کہ وہ بھری محفل میں یاروں کی محفل میں نہیں ۔ ہزاروں لاکھوں معمولی آدمیوں کی محفل میں کھل کھلا کر ہنس پڑے ۔ یہ گدگدی ایک بہت بڑے شاہکار کا پیش خیمہ ہوگی ۔

پرانا محل

کرشن چندر نے مسلم ضیائی سے پوچھا۔ "بھئی تم شادی کیوں نہیں کرتے ہو۔ اب تو تمھاری آنکھوں پر عینک بھی آچکی ہے۔"

مسلم ضیائی نے اپنی عینک کے شیشوں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ "تم نہیں جانتے۔ آہ!"

"کون ہے وہ ظالم!" کرشن چندر نے پوچھا۔

"وہ ہر روز کافی ہاؤس میں آتی ہے۔ آہ!"

گاڑی چار مینار کے گرد گھوم کر ایک گل فروش کی دکان پر کھڑی ہو گئی ۔ مسلم ضیائی اتر کر گجرے خریدنے لگے ۔

"یہ گجرے کیا کرو گے ؟"

"میں اُسے بھیج دوں گا ۔ اُسے یہ گجرے بہت پسند ہیں"

"آہ !" کرشن چندر نے کہا ۔ "مجھے اپنی بیوی کیلئے چوڑیاں خریدنا ہیں ۔ اور تھوڑا سا ہمرو اور ایک مرادآبادی پاندان "

"واہ ! یہ سب چیزیں تو قریب ہی کے بازار سے مل سکتی ہیں" مسلم ضیائی نے جواب دیا ۔

"آہ !" کرشن نے کہا ۔

قریب کے بازار سے یہ سب چیزیں مول لے کر وہ لوگ واپس ہوئے ۔ تو چار مینار کے قریب گاڑی روک کر ایک طرف کھڑی کر دی گئی ۔ مینار پر گھڑی میں ابھی پانچ نہ بجے تھے ۔ چاروں طرف سیٹیاں بج رہی

رہی تھیں ۔ سائیکل والے سائیکلوں سے اتر کر ۔ گھوڑا گاڑی والے گاڑی والے گاڑی ٹھہرا کر ۔ کار والے ۔ کار ایک طرف کر کے اور پیدل چلنے والے جہاں تھے وہیں رک کر جامد و ساکت ہو گئے ۔ چاروں طرف جدھر نگاہ جاتی تھی خاموشی تھی ۔ گہرا سناٹا ۔ اور مخلوق کے سر جھکے ہوئے تھے اور شیروانیوں کے بٹن گلے تک بند تھے ۔ اور آنکھیں آسمان کی پہنائیوں کو چھوڑ کر زمین کی پتھریلی سطح پر جھکی ہوئی تھیں اور پسینے میں عرق عرق پیشانیاں کسی نظر نہ آنے والے خدا کے آستانے کی جبہ سائی کر رہی تھیں ۔ یکایک کہیں سے ایک سیاہ موٹر گذر گئی ۔ مینار کے سامنے کھڑے ہوئے سپاہیوں نے سلامی اتاری ، اور گاڑی بہت دور چلی گئی ۔ اور یکایک مینار کے گھڑیال نے پانچ بجائے اور یکایک جیسے ساری فضا کی خاموشی جھن سے ٹوٹ گئی اور جھکی ہوئی گردنیں اوپر اٹھ گئیں ۔ اور موٹر اور سائیکل اور گھوڑا گاڑیاں چلنے لگیں ۔ اور دکاندار گاہکوں کو سودا

دینے لگے۔ اب پھر وہی شور و غل تھا۔ وہی ہاؤ ہو۔ وہی زندگی۔

"کیا ہوا تھا بھئی۔" کرشن چندر نے ایک چاؤ وش سے پوچھا۔ جو اُس کے قریب ہی کھڑا تھا۔

چاؤ وش نے اُسے گھور کر دیکھا۔ اور اپنی تلوار کے دستے پر ہات رکھ کر کہا۔ "ابھی سرکار کی سواری ادھر سے گزر کر گئی ہے۔ اندھے ہو کیا تمھیں اتنا بھی معلوم نہیں۔"

"چلو۔ چلو۔ گاڑی بڑھاؤ۔" مسلم ضیائی نے ٹیکسی والے سے کہا۔ اور پھر مُڑ کر کرشن چندر سے کہنے لگا۔ "یہ چاؤ وش آزاد عرب کے لوگ ہیں۔ اُن سے "یا چاؤ وش" کہہ کے گفتگو کرنا چاہیئے "بھئی" کہہ کے نہیں۔ وہ تو یوں کہو۔ شریف چاؤ وش تھا۔ لڑاکا ہوتا تو ابھی اس بات پر تمھارے پیٹ میں چھُری بھونک دیتا۔

"یا چاؤ وش!" کرشن چندر نے گھبرا کر کہا۔ "اب کہاں چلوگے۔"

"راجہ شامراج جی کے ہاں دعوت ہے۔ چھ بجے!"

راجہ شامراج کا محل۔ پرانا محل۔ شہر میں واقع ہے اونچی فصیل کے اندر ایک خوشنما باغیچہ ہے۔ باغیچے میں ایک مور ناچ رہا تھا۔ جب ادیب لوگ وہاں پہونچے تو دس بارہ موٹریں ایک طرف استقبال کے لئے کھڑی تھیں۔ راجہ صاحب غائب تھے۔ ادیبوں کو موٹر ڈرائیوروں سپاہیوں اور راجہ صاحب کے مصاحبوں نے جھک کر سلام کیا۔ اور یہ بےچارے کچھ حیران۔ کچھ پریشان، کچھ پشیمان سے۔ محل کی سیڑھیوں پر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اتنے میں کسی نے کہا۔ اوپر تشریف لائیے۔ ادھر لائبریری کی طرف، یہاں راجہ صاحب سے تعارف

ہوا۔ بظاہر صدق و صفا کی مورت۔ دُبلے پتلے، پیشانی پہ تلک، اتنی بڑی لائبریری۔ اتنی اچھی لائبریری ہر موضوع پہ کتابیں جنھیں غالباً آج تک کسی نے کھول کر پڑھا نہ تھا۔ بہت سی کتابوں کے ورق بھی کاٹے نہیں گئے تھے۔ پوری لائبریری میں صرف دو بچے پڑھ رہے تھے یہ سنگ مرمر کے مجسمے تھے اور ایک سنگ مرمر کی کتاب کھولے ہوئے اُس پر جھکے ہوئے تھے۔ اور نہ جانے کتنے سال سے اس طرح جھکے ہوئے اسی کتاب کے اسی صفحہ کو پڑھ رہے تھے۔ یہ سنگ مرمر کے صفحے۔ یہ سنگ مرمر کی کتاب۔ یہ سنگ مرمر کے محل، لیکن ہم لوگ یہاں کیا کر رہے تھے۔ کیوں اس دیارِ غیر میں اجنبیوں کی طرح گھوم رہے تھے۔ وہ گھر جو اپنا نہ تھا۔ جس کے ہر سنگ مرمر کی رگ کا خون سفید ہو چکا تھا۔ سامنے مور ناچ رہا تھا۔ ایک کمرہ اشتراکیت کے موضوع سے متعلق تھا۔ یہاں ہزاروں کتابیں جمع تھیں۔ صاحب ہمیں اس طرح دیکھ

رہے تھے۔ گویا ہم تماشہ ہوں اور وہ تماشائی۔ ان کی نظریں گویا کہہ رہی تھیں۔ تمہارے ایسے سینکڑوں لوگ یہاں آتے ہیں۔ اور دعوت کھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہم ادیبوں کو بلاتے ہیں۔ اور سرکس والوں کو بھی اور مداریوں کو۔ اور مسخروں کو، یا سیاح آتے ہیں اور بھک منگے بھی۔ اور سیاست داں بھی۔ ہمارے راجہ صاحب سب کو دعوت پر بلاتے ہیں۔ ہمارے راجہ صاحب بہت اچھے ہیں۔ لیکن اُن کے اچھا ہونے سے آپ لوگ اچھے نہیں ہو سکے۔ سردار صاحب آپ کی قمیص پھٹی ہوئی ہے۔ آپ کی شیروانی کا بٹن غائب ہے سبطے میاں۔ قدوس صاحب آپ نے یہ جھولا کیسے ٹکا رکھا ہے۔ مہندر بھائی آپ نے سر پر یہ جنگل سا کیا اگا رکھا ہے۔ کرشن صاحب آپ کی پتلون پر دس پیوند ہیں آپ لوگ یہاں کیا کھا کر ترقی پسندی کا دعویٰ کریں گے۔

سامنے مور ناچ رہا تھا۔

ایک صاحب جو غالباً راجہ صاحب کے وزیر معلوم ہوتے تھے بولے۔ "سرکار کا عجائب گھر بھی دیکھیئے گا"۔ سرکار کا عجائب گھر۔ اس وقت تو یہ سارا محل عجائب گھر معلوم ہو رہا تھا۔ جس میں نمونے کے طور پر ترقی پسند ادیب مختلف کمروں میں رکھ دیئے گئے تھے۔ اس بالکونی میں سجاد ظہیر۔ ڈاکٹر تاراچند اور ملک راج آنند قید تھے۔ اس کمرے میں سردار اور عادل رشید سبط حسن اور رفعت سروش محبوس تھے۔ اس شیشے کی الماری کے قریب کرشن چندر، ...ن گوپال اور فراق گورکھپوری استادہ تھے۔ فراق صاحب کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار نمایاں تھے۔ اور اُن کی گول گول پتلیاں حیرت و استعجاب میں ڈوب کر ادھر اُدھر مجذوبانہ انداز میں تک رہی تھیں۔ ابے۔ ہم لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ ہم دعوت کھانے آئے ہیں۔ یا اپنا خون پینے آئے ہیں۔

...راق بولے۔ بلند آواز میں۔ "بھئی میں تو چلتا ہوں"

یہ کہہ کر وہ چلے۔

"ٹھہرئیے۔ ٹھہرئیے" وزیر نے کہا۔" وہ راجہ صاحب کا عجائب گھر!"

"اچھا صاحب" فراق صاحب نے ہار مان کر کہا: "وہ بھی ہو جائے"

ایک کمرے میں پتھر کے بُت۔ ایک کمرے میں دیوتاؤں کے بُت۔ پتھر کے نہیں دھات کے۔ ایک کمرے میں آصفیہ خاندان کے خطوط جو راجہ صاحب کے بزرگوں کو لکھے گئے تھے۔ راجہ صاحب کے بچوں کے خط۔ جو انہوں نے اردو میں لکھے تھے۔ یہ خط شاید اردو سے محبت کے ثبوت میں تھے۔ ایک کمرے میں مختلف تصاویر۔

وزیر نے کہا" مجھے وہ تصویر بہت پسند ہے"

کوئی خاص بات اُس تصویر میں نہ تھی۔ ایک خوبصورت عورت کی تصویر تھی۔ جس نے ایک سپید ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس طرح کہ ساڑھی کے اندر عورت تقریباً ننگی نظر

آتی تھی۔ کمر کے خم میں گاگر لئے کھڑی تھی۔
بے حد پسند ہے۔ وزیر کے ہونٹ کھلے تھے۔ ہائے
وہ موٹے موٹے کھلے کھلے بدصورت ہونٹ!
سامنے مور ناچ رہا تھا۔

"میں جا رہا ہوں بھئی کرشن۔" فراق نے جھلا کے کہا۔
"ٹھہریئے۔ ٹھہریئے وزیر نے گھبرا کے کہا۔ "چائے
پی کے جائیے۔"
"ہوں" فراق صاحب نے کھرج میں کہا۔ اور باغیچہ
میں جا کے چائے پینے لگے۔
چائے پینے کے بعد راجہ صاحب کے ساتھ ترقی پسند
ادیبوں کا فوٹو کھینچا گیا۔ دائیں طرف سجاد ظہیر۔ بائیں طرف
کرشن چندر اور کرسیوں پر دوسرے ادیب اور بہت سے
ادیب مصاحبوں کی طرح پیچھے کھڑے تھے۔ سردار اور
سبطے اور دوسرے انقلابی ادیب۔

"میں حاضر ہوں سرکار" فوٹوگرافر نے کہا۔

راجہ صاحب نے اشارہ کیا۔ اور فوٹو لے لیا گیا۔

فراق کے بدن میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ لیکن اب فوٹو لے لیا گیا تھا۔ فوٹو جو بے حد ضروری تھا۔ فوٹو سے راجہ صاحب کی ترقی پسندی تو کیا ظاہر ہوتی تھی۔ اپنی ذلت پسندی کی انتہا ہوگئی تھی۔ سردار نے کہا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا۔ سبطے بولا۔ انقلاب کے دوران میں جاگیردار ایسے ایسے کئی فوٹو پیش کرکے اپنے آپ کو اشتراکیت کا علمبردار ثابت کریں گے۔ اوہنہ، ان باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ قدوس صہبائی بولے۔ فوراً گردن ناپ دی جائے گی۔ مگر ایسا ہوا کیوں؟ مدن گوپال چیخے۔ ہم یہاں آئے کیوں؟ فراق بولے۔ اگر کوئی میرے ساتھ چلنا ہے تو چلے۔ ورنہ میں تو ابھی چلا۔

"ٹھہریئے۔ ٹھہریئے" وزیر نے چلا کر کہا "پان اور عطر حاضر ہے"

سونے کا عطر دان اور چاندی کا پاندان۔ اور پان کھلا کے اور عطر لگا کے اور ہات میں ایک گلدستہ تھما کے ادیبوں کو رخصت کر دیا گیا۔ چلتے وقت یہ محسوس ہو رہا تھا۔ گویا کسی نے منہ پر تھوک دیا ہے۔ پیشانی پہ کیچڑ مل دی ہے۔ اور روح میں غلاظت کے انبار لگا دیئے ہیں۔ ہر شخص الو کا پٹھا معلوم ہو رہا تھا۔

سامنے مور ناچ رہا تھا۔

واپس قیام گاہ پہنچ گئے۔ تو دیکھا سامنے صحن میں جگر حیدر آبادی کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ کہئے صاحب راجہ صاحب کی دعوت سے فارغ ہو گئے۔

اس کے بعد ہنسے۔ ہونٹ لال۔ مسوڑھے لال۔ دانت لال۔ زعفران رنگ چہرے پر رستا ہوا سرخ زخم۔ جی میں

آیا گلا گھونٹ دیا جائے۔ سردار نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اور اپنے آپ پہ بے حد جبر کر کے بولے۔ بندۂ خدا بتا تو دیا ہوتا۔ کہاں دعوت ہے۔ ہمیں کیا معلوم یہ شاہراج کون ہیں؟ ...... ہم تو سمجھے تھے کوئی ادب نواز صاحب ہوں گے۔

"ادب نواز تو وہ ہیں ورنہ آپ کو بلاتے کیوں"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر ــــــ مگر، یہ راجہ۔ یہ نواب۔ یہ یار جنگ بہادر، تم کچھ سمجھو گے بھی کہ نہیں"

جگر گھوم گئے۔ مطبخ کی طرف جاتے ہوئے بولے "آپ کے لئے شام کے کھانے کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔ شام کے کھانے سے پہلے اردو مجلس کے ہاں سے تمام مندوبین کو بلوا آیا ہے۔ جانا ہوگا"

وہ مڑ کر گھوم گئے۔ فراق نے انھیں معاف نہیں کیا تھا۔ اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھماتے ہوئے بولے۔ یار دعجب آدمی ہے۔ چوبیس گھنٹے سر پر سوار رہتا ہے۔ جب دیکھو۔

قیام گاہ میں حاضر ہے۔ یہ شخص سوتا نہیں۔ کھاتا نہیں۔ پیتا نہیں
جب دیکھو۔ ادھر سے اُدھر۔ اُدھر سے اِدھر گھومتا رہتا ہے
اسے کیا ہوا ہے۔

اس کے بعد خود ہی سر جھکا کے حیران و ششدر کھڑے
رہ گئے۔ دیر کے بعد سبطے سے مخاطب ہوئے۔ کچھ سمجھ میں
نہیں آتا ـــــ آؤ تمھیں کچھ رباعیاں سنائیں۔

"آپ چلئے۔ میں ابھی آتا ہوں"
سبطے نے کرشن کو بھی گھسیٹنا چاہا۔ چلو۔ رباعیاں سنو
تم بھی۔ کمبخت رباعی بہت اچھی کہتا ہے۔

عادل رشید پتلون کی کریز درست کرتے ہوئے
بولے۔ بہت بڑا شاعر ہے۔

سبطے نے کہا۔" ان کی شاعری ہندستانی کلچر کی معراج
ہے۔

کرشن چندر نے کہا۔ میں نہیں جاؤں گا رباعیاں سننے
اس وقت۔

لہجے میں ضرورت سے زیادہ تلخی تھی۔ حسد اور رشک اور اک مجبور۔ گرانبار۔ حریصانہ رقابت۔ کہ بارے میں شاعر کیوں نہیں یہ ہر محفل میں شاعر کیوں چھا جاتا ہے۔ اور کیوں افسانہ سنتے ہی لوگوں کو جماہیاں آنے لگتی ہیں کاش میرا ہر افسانہ فراق کی رباعی کی طرح خوب صورت ہوتا .....

بطخوں کے ساتھ ایک شام

شام اور رات کے بیچ کے وقفے کی دھندلی دھندلی اُداسی، ادیبوں کی پھیکی پھیکی اکتائی ہوئی، تھکی ہوئی صورتیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے وسیع و عریض برآمدے کے باہر بطخوں کا بے ہنگم خرام، اردو مجلس میں چائے اور مشاعرے کا بند و بست۔ شاعروں کی آوازیں اور چینی کے پیالوں میں چلتے ہوئے چمچے۔ اور سرکیوں کے پیچھے پردہ پوش خواتین کی کڑی تنقید۔

ہائیں۔ یہ کرشن چندر رہیں۔
کون وہ ٹھنگنے سے...... اری وہ......
کرشن چندر نہیں جگدیش چندر معلوم ہوتے ہیں۔

قہقہہ۔
کرشن چندر کا کھانسنا۔ وہ کھانسی گویا کہہ رہی ہو۔ دیکھئے
ہم بھی سُن رہے ہیں۔

عادل رشید اس طرح بیٹھے ہوئے تھے گویا میر مشاعرہ
وہی تھے۔

قدوس صہبائی ـــــ گویا ابھی چوتھے درویش کی
سرگزشت سنا کے سُنا رہے ہوں۔

فضا میں اُجلے پن کے باوجود تیرگی۔ عرصہ زماں میں
عمال کے باوجود ماضی کا دھندلکا۔ متکلف محبت کے باوجود
اک کھنچاؤ۔ جیسے رگیں ٹوٹ رہی ہوں۔ جیسے دو زمانے
دو نسلیں۔ اور دو زاویہ ہائے ایک دوسرے کے قریب
آنے کی ناکام کوشش کر رہے ہوں۔ جیسے اندھیرا اُجالے

ہیں اور ماضی مستقبل میں اور موت زندگی میں اپنا عکس ڈھونڈھ رہی ہو۔

کیفی نے اپنی نظم مرثیہ خوانوں کے انداز میں سنائی۔

خاموشی۔ گہرا سناٹا۔

ایک پیر و مرشد نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ آپ شاعر ہیں۔

پھر خاموشی۔ لوگ اس جملے کی اہمیت پر غور کر رہے ہیں۔

سب مؤدب بیٹھے ہوئے ہیں۔ گویا کسی اہم بم کا انتظار کر رہے ہیں۔

پھر کسی نے کہا۔ میرزا صاحب آپ کچھ سنایئے۔

میرزا صاحب سنانے لگے "جمنا کا کنارہ"

حریری پردوں کے پیچھے کسی نے کہا۔ کنارہ نہیں، کنارہ کہئے۔

تہذیب اور کلچر موت کے زہراب میں گرفتار ہوں۔

لیکن گرامر نہیں بدل سکتی۔ زندگی بدل جائے لیکن زبان کی ہیئت نہیں بدل سکتی۔ زمان و مکان میں تغیر کی نمو ہو سکتی ہے ملک و ملت اور افراد و کردار کی ہیئت میں۔ اطوار و گفتار میں۔ اُن کی سماجی۔ سیاسی۔ شعوری زندگی میں انقلاب آ سکتا ہے لیکن زبان میں کوئی تغیر ممکن نہیں۔ وہ موت کی طرح اور خدا کے آخری حکم کی طرح قطعی ہے۔

اے مثالی معابد کو پوجنے والی مخلوق۔ سر جھکا کر مودب بیٹھی رہ۔ اس کی فکر نہ کر کہ سر سے طوفان گزر رہا ہے۔ قاعدر کی بیش قیمت چائے دانیوں میں اُبلتی ہوئی چائے انڈیل۔ صحن میں آہستہ خرام کرلاکراتی ہوئی بدصورت بطخوں کو دیکھ۔ اور سن۔ جمنا کا کنارہ —— نہیں نہیں۔ جمنا کا کنارہ! معاف کیجئے گا . . . . . .

کرشن چندر نے جھک کر نظر کے کان میں کہا۔ خودکشی کے لئے کون سی جگہ بہتر رہے گی۔

نظر نے بہت سوچ بچار کے بعد کہا۔ ویکا جی کا ہوٹل۔

تو چلو پھر وہیں۔

آخر کانفرنس ختم ہو گئی۔ سبطے نے فن صحافت پر اپنا مقالہ بھی پڑھ لیا۔ کسی شخص نے اُسے ٹوکا نہیں۔ سردار نے اقبال کے رجعت پسندوں نقادوں کو آڑے ہاتوں لیا۔ کسی نے اس کے پیٹ میں چھرا نہیں بھونکا۔ ڈاکٹر تارا چند نے اردو کا شجرۂ نسب دو ہزار سال کے پرانے ہندوستان کی تہذیب سے جا ملایا۔ کسی ہندو مہا سبھائی نے اُف تک نہ کی، لیکن جب کانفرنس ختم ہونے کے بعد مخدوم نے آہستہ سے کہا۔ بھئی وہ ریلوے کے مزدور تم لوگوں کو اپنے جلسے میں بلانا چاہتے ہیں۔ تو بہت سے لوگ زکام اور چھینک اور بخار سے بیمار پڑ گئے۔ جگر صاحب نے بڑی مستعدی سے لوگوں کے

بستر باندھنا شروع کر دیئے۔ کچھ لوگ بازار میں خرید و فروخت
کرنے چلے گئے۔ کچھ لوگ P.E.N کانفرنس میں شرکت
کرنے کے لئے سٹیشن سے جے پور کا ٹکٹ لانے کے لئے
چلے گئے۔ کچھ لوگ بیمار ہو کر بستر پہ دراز ہو گئے۔ مزدوروں
کے جلسے کے لئے سرف کیفی۔ سردار۔ اور ساحر بچے۔

مخدوم نے تعارف کرایا یہ کیفی ہیں۔

انقلاب زندہ باد

یہ سردار ہیں۔

انقلاب زندہ باد

یہ ساحر لدھیانوی ہیں۔

انقلاب زندہ باد

مشینوں پہ کام کرنے والے لوگ۔ سانولے کالے
لوگ، موٹے موٹے جبڑوں کھردرے ہات پاؤں والے لوگ
بدصورت لوگ۔ غلیظ لباس پہننے والے لوگ۔ بُرا کھانا
کھانے والے لوگ۔ لوگ جو نہ "واللہ" کہہ سکتے تھے

"مکرر ارشاد" "نے کیا شعر ہوا ہے"۔ لوگ جن کے آداب اُن کی زندگیوں کی طرح کھردرے تھے۔ اُن کے لباس کی طرح وحشی تھے۔ اور اُن کے اعتقاد کی طرح مضبوط تھے یہ لوگ جو خوبصورت الفاظ میں شاعروں کی تعریف نہیں کر سکتے تھے۔ جو خاموش تھے۔ اور سن رہے تھے۔ اور مکرر ارشاد نہ کہنے کے باوجود اُن کے چہروں کی آب اور ان کی آنکھوں کی چمک، اور اُن کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گویا کہہ رہی تھی ہم خوش ہیں۔ کیونکہ تم ہمارے ہو۔ ہم میں سے ایک ہو۔ ہماری خوشیوں اور غموں کے گیت گاتے ہو۔ اور اپنے الفاظ کی حسین تصویروں میں ہمارے دکھ کا مداوا ڈھونڈتے ہو۔ تم ہماری برادری میں سے ہو۔ اُس انسانوں کی عظیم برادری میں سے جہاں کسی انسان کا حق دوسرے انسان کے حق پر غالب نہیں سمجھا جاتا۔ آؤ۔ آؤ۔ ہم تمہارا استقبال کرتے ہیں۔ چمکتی ہوئی آنکھوں سے۔ خاموش کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اور بھینچی ہوئی مضبوط مٹھیوں سے۔ خوش آمدید

ساتھیو۔ اب تک تم ویرانے میں گھومتے رہے۔ آج تم گھر میں آئے ہو۔ ہمارے پاس حریری پردے نہیں۔ ننگی دیواریں ہیں، سونے کے پلنگ نہیں۔ پتھر کا فرش ہے۔ ہماری جیبیں خالی ہیں۔ لیکن دل آنسوؤں سے معمور ہیں۔ محبت کے آنسو۔ شفقت کے آنسو۔ رفاقت کے آنسو!

...... آؤ...... آؤ...... ساتھیو!

ساحر لدھیانوی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور وہ شعر کہتے کہتے رک گیا۔ اور اس کی نمناک آنکھوں میں جیسے سارا مجمع ناچ گیا۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا اپنے عزیزوں سے گلے مل رہا ہو۔ یہ اس کی ماں تھی۔ یہ بھائی۔ یہ بہن۔ یہ بچپن کا محبوب ساتھی۔

آؤ...... آؤ...... ساتھیو!

واپسی

اب وہ لوگ فارغ ہوکر حیدرآباد کے سٹیشن پر پہنچ گئے تھے۔ ریلوے کے مزدوروں نے تھرڈ کا ایک چھوٹا سا ڈبہ ان کے لئے وقف کرا دیا تھا۔ تاکہ انہیں دوران سفر میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اب اس کمرے میں ان کا سامان رکھا ہوا تھا۔ سٹیشن کا پلیٹ فارم تھرڈ کلاس کی مخلوق سے اٹا ہوا تھا۔ اور غلیظ بستروں اور زنگ آلود سیاہ ٹرنکوں۔ بدبودار ٹوکروں اور کھانچیوں سے ایک غلیظ مال گودام کی صورت

میں مبدل ہو چکا تھا۔ جالی دالی ٹوکریوں میں مرغیاں کڑکڑا رہی تھیں۔ اور اُن کے قریب سیاہ فام گھاٹنیں اپنی کمر کے گرد لپٹی ہوئی مرہٹی ساڑھی کے پلّو سے جوئیں چننے میں مصروف تھیں۔ اتنے میں زور سے ایک موٹر کے ہارن کی آواز کانوں میں آئی۔ اور ایک سیاہ رنگ کی سیڈان سٹیشن کے پلیٹ فارم پر جہاں موٹر گاڑیوں کا آنا ممنوع ہے چلتی ہوئی دکھائی دی۔ پوں۔ پوں۔ آگے سے ہٹ جاؤ۔ پوں۔ پوں ۔ ۔ ۔ ۔ پولیس کے آدمی ہنٹر ملے ہوئے لوگوں کو پرے ہٹانے لگے۔ قلی اسباب راستے سے اٹھانے لگے۔ راستہ صاف ہوتا گیا۔ پوں۔ پوں۔ موٹر پلیٹ فارم پر چلتی گئی۔ اور آخر اک ایسے ڈبے کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئی جو کسی بڑے آدمی کا سپیشل سیلون معلوم ہوتا تھا۔ کار میں سے پہلے سنہری وردی میں ملبوس ایک اردلی اُترا۔ پھر اس نے کار کے دروازے کا پٹ کھولا۔ اور ــــــ جب تک پولیس کے لوگوں نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال لیا۔ اور پھر کوئی

کچھ نہ دیکھ سکا۔ کہ کیا ہے۔

کیا ہے؟ - ایک نے پوچھا۔

سر سلطان بالقابہ کا سپیشل سیلون ہے۔

سر سلطان احمد جو وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہیں

جی ہاں وہی۔

یہاں حیدر آباد میں کیا کرنے آئے ہیں۔

اپنے کسی عزیز کی شادی یہاں کرنے آئے ہوئے تھے

وہ ۔ ان کے لئے کمپارٹمنٹ ہے۔ اور یہ باہر کیا رکھا

ہوا ہے دیکھتے نہیں ہو۔ یہ جہیز کا سامان ہی تو ہے۔

مرغی کے بدبو دار ٹوکروں۔ اور غلیظ حمام سے

بھری ہوئی کھانچیوں اور زنگ آلود ٹرنکوں سے نظریں

پھسلتی ہوئی اس ساز و سامان پہ پڑیں جہاں چاندی کے

برتن پڑے تھے۔ اور اخروٹ کی بیش قیمت چیزیں۔ اور

روپہلے پایوں والے پلنگ۔ اور صراحیاں جن پر طلائی

آب و رنگ تھا۔ اور پھر وہاں سے نظریں پھسلتی ہوئیں جوئیں

چینتی ہوئی مٹیالی کالی سلونی غلیظ گھاٹوں کے جھنڈوں کو
بہ انداز تنفر دیکھتی ہوئیں اُس کھڑکی کے باہر جا کر رک گئیں
جہاں ریشمی پردہ لہرا رہا تھا۔ آگے مت جاؤ۔ ریشمی پردہ
کہہ رہا تھا۔ آگے مت جاؤ۔ یہ ریشم کی دیوار ہے۔ اس
دیوار کے ادھر تمھاری دُنیا ہے۔ غریبی کے متعفن کیچڑ میں
کلبلاتی ہوئی مخلوق، ریشم کی دیوار کے اس طرف
دوسری دُنیا ہے۔ جس کی ہر سانس میں آسودہ تعیش
کی نعطر ہے۔ ہر تبسم میں کامراں امنگوں کی شراب ہے
ہر لَے میں فتح کا مغرور نغمہ ہے۔ اور ان دونوں دنیاؤں
کے بیچ میں ایک پتلی شفاف سی ریشم کی دیوار ہے۔
اتنی پتلی اور ایسی شفاف کہ لوگ آر پار دیکھ سکتے ہیں۔
اس دُنیا کے لوگ اُس دُنیا کے لوگوں کو اور اُس دنیا
کے لوگ اس دُنیا کے لوگوں کو اجنبی نگاہوں سے۔
دشمن نگاہوں۔ نفرت کی نگاہوں سے تک رہے ہیں۔ تک
رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں۔ ڈر رہے ہیں۔ لیکن کوئی ادھر

اُدھر یا اُدھر سے اِدھر نہیں آتا۔ کوئی۔ کوئی اس پتلے شفاف سے پردے کو ہات کے ایک ہی جھٹکے سے چاک کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔

آؤ۔ آؤ۔ سالگرہ۔ دیکھو یہ مسز سلطان احمد کا سپیشل سیلون ہے۔ تمہارا تھرڈ کلاس کا ڈبہ ہے۔ یہ ان کا سبز وردی میں ملبوس بیرا ہے۔ یہ پھٹے ہوئے کالر والا علی سردار جعفری ہے۔ یہ اشرڈٹ کا میز ہے۔ جس پر کشمیر کے کاریگروں نے حسین پچی کاری کی ہے۔ وہ رفعت سروش کا بستر ہے جس میں درجنوں پیوند لگے ہیں۔ یہ طلائی صراحی ہے۔ وہ تانبے کا لوٹا ہے۔ یہ مخمل کی رضائی ہے۔ وہ کھدر کی اوڑھنی ہے۔ یہ موت ہے۔ وہ زندگی ہے۔

یہ ماضی ہے ۔ وہ مستقبل ہے ۔

یہ اندھیرا ہے ۔ وہ اجالا ہے ۔

دیکھو ۔ دیکھو ۔ وہ دیوار ٹوٹ گئی ۔ موت زندگی
ماضی مستقبل اور رات سحر سے گلے مل رہی ہے ۔
لیکن ہیں ۔ دیوار کہاں ٹوٹی ہے ۔ یہ تو گاڑی چل
رہی ہے ۔ آہستہ آہستہ ۔ لوگ الوداع کہہ رہے ہیں ۔ مسلم
ضیائی کی آنکھوں میں آنسو ہیں ۔ ابراہیم جلیس کے رخساروں
کے گڑھے اور گہرے ہوتے جا رہے ہیں ۔ نظر کے بال اور
بکھر گئے ہیں ۔ اور بشیر ناظمی کی محبوب نگاہیں کہہ رہی ہیں ۔ ہم
شرمندہ ہیں ۔ سب شرمندہ ہیں ۔ نہ جانے کیوں ۔

گاڑی چل رہی ہے ۔

جگر صاحب ہات ہلا کر جلیس سے کہہ رہے ہیں ۔ میں بہت جلد گاڑی سے لوٹ آؤں گا ۔ اور چھوٹی بہن کو ساتھ لیتا آؤں گا ۔ فکر نہ کرنا ۔ اچھا ہے ۔ اپنے مہمانوں کے ساتھ جا رہا ہوں ۔ تھوڑی دُور ساتھ رہے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا خیال ہے اب وہ اچھی ہو گئی ہوگی چھوٹی بہن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

گاڑی چل رہی ہے ۔

سورج ڈوبتا جا رہا ہے ۔

سورج ڈوب گیا ۔

حیدرآباد غائب ہو گیا ۔

گاڑی پھر بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی گویا اُن بھک منگوں کا منہ چڑا رہی تھی جو پلیٹ فارم کے کنارے

کنارے اور بعد میں ریل کی پٹری کے کنارے کنارے بھاگ
رہے تھے۔ سگنل مینوں کے کیبن شور کے چھوٹے چھوٹے
ڈربوں کی طرح سطح زمین سے اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی
آگے چلی جا رہی تھی۔ لیکن انجن نے ابھی اپنی رفتار تیز نہیں
کی تھی کیونکہ وہ ابھی ابھی گودام سے کوئلہ اور نل سے پانی
لے کر فارغ ہوا تھا۔ اور ایک تازہ دم بچے کی طرح گرگرا
رہا تھا۔ بھکاری چلا رہے تھے۔ بابو۔ صاحب۔ پیسہ۔
بابو۔ صاحب۔ پیسہ۔ گاڑی شہر سے باہر میدان میں
آ گئی تھی۔ سٹیشن کی عمارت بہت دور پیچھے رہ گئی تھی۔ اور
اب یہاں سطح مرتفع پہ گارے کی بنی ہوئی جھونپڑیاں نظر
آتی تھیں۔ ان پر کھپریل کی چھت تھی۔ سوکھیا کی ماری ہوئی
بھینسیں میدان میں کھڑی جگالی کر رہی تھیں۔ اور سورنیاں
اور سور آس پاس چر رہے تھے اور اتنی دور سے وہ
اتنے چھوٹے چھوٹے معلوم ہو رہے تھے۔ جوہڑوں میں بدبودار
غلیظ گدلا سبز پانی ٹھہرا ہوا تھا۔ اور کہیں کہیں [illegible]

لوگ رفع حاجت کے لئے گاڑی کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے
بھک منگوں کی آواز بار بار کانوں میں آ رہی تھی۔ بابو صاحب
پیسہ۔ بدھ کے وقت میں یہی ہندوستان تھا۔ یہی غلیظ جوہڑ
یہی گارے کی جھونپڑیاں۔ یہی بھک منگے، اشوک کے عہد
میں بھی یہی ہندوستان تھا۔ اکبر کے عہد میں بھی یہی۔ اور آج
دو سو سال کی انگریزی حکومت کے بعد بھی لوگ اسی طرح
گاڑی کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے۔ آئے۔ آئے۔ کہیں سے
آئے۔ وہ زندگی کی بیدار افق۔ اس ساکن منجمد بے حس
دنیا میں۔ اس گہری اتھاہ تیرگی میں آئے۔ کہیں سے آئے
وہ نور کی کرن، وہ صبح کی سرخ لکیر، محبوب کے پائل
کی ناچتی ہوئی آواز۔ آئے کہیں سے آئے۔ اور تاروں
بھری افشاں کی طرح چمک کر ہندوستان کے ماتھے
پر جگمگائے ......

پھر گاڑی تیز چلنے لگی۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ تاریکیاں شبنمی لبادے اوڑھ کر چاروں طرف چھاگئیں۔ دل کسی نامعلوم خوف اور اداسی سے معمور ہو گئے، سب چپ تھے۔ صرف جگر اک ملتجیانہ تبسم سے ادیبوں کی طرف دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

میں اپنے گاؤں جارہا ہوں۔

سب خاموش تھے۔

میری بہن بیمار ہے۔

کوئی نہیں بولا۔

مجھے اپنی بہن سے بڑی محبت ہے۔ مجھے اپنے گھر میں سب سے چھوٹی بہن ہی پیاری ہے۔ ہماری ایک ہی بہن ہے۔ اور ایک عرصے سے بیمار ہے لیکن یہی اُسے چند وجوہات سے اب تک حیدرآباد نہ لا سکا۔

چپ چاپ..... گاڑی چلتی رہی۔

میں اُسے حیدرآباد لے آؤں گا۔ ڈاکٹر اجنکیا سے اس کا علاج کراؤں گا۔ ڈاکٹر نائیڈو کو بھی دکھاؤں گا۔

میں نے دو سو روپیہ اس کی بیماری کے علاج کے لئے بچا کے رکھا ہے۔

ہم دونوں کیسے امرود توڑ کر کھایا کرتے تھے۔ میں اس کے لئے پٹھمن کے گھر سے املی چرا کے لایا کرتا تھا۔ اُسے میٹھے بیر بہت پسند ہیں.........

وہ اپنی یادوں میں کھو یا گیا۔ سب لوگ چپ رہے۔

ہولے ہولے کیفی گنگنانے لگا۔ اپنی محزوں محبت کا گیت، وہ گیت جس میں اُس نے اپنے کھانستے ہوئے سینے کی آرزوئیں، اپنی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کا نور اور اپنے زرد چہرے کی راکھ کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ وہ ہولے ہولے گا رہا تھا۔ جیسے اپنے دل کے بچّے کو لوری دے رہا ہو۔ وہ خود اپنے لئے گا رہا تھا۔ صرف اپنے لئے

لیکن اُس ڈبے میں کون تھا جس نے اُس گیت کو اپنے لئے نہیں سمجھا۔ جسے اُس کے ہر شعر میں۔ ہر مصرعے میں، ہر لفظ میں اپنے عشق کی جھلک، اپنی ناکامی کی تصویر اور اپنے محبوب کی تصویر نظر نہیں آئی۔ جیسے تصور میں کوئی مسکرا اٹھا۔ کسی نے انگڑائی لی۔ کہیں سے پائل بج اٹھی۔ اور نغمہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا...... اک گرانبار افسردگی بوجھل غبار بن کر سانس رد کنے لگی۔ اور پھر ساحر اپنے چیچک زدہ چہرے کے داغوں کو سہلاتا ہوا اپنی سیٹ پر جھک گیا۔ اور اپنے ہاتھ ٹھوڑی پر رکھے ان نغموں کا ذکر کرنے لگا جو اُس نے اپنے محبوب کے پیار کی خاطر لکھے تھے۔ وہ نغمے جن کی پہنائیوں میں اس کی زندگی تھی۔ بہاروں کے سرچشمے اُبلتے تھے۔ اور جس کے زعفران رنگ کھیتوں میں اس کی سرمست آرزوؤں کی مہک تھی۔ ہولے ہولے آہستہ آہستہ۔ شرمائے ہوئے، مجرمانہ انداز میں وہ گا رہا تھا۔ گاڑی جتنی تیز تھی۔ گیت اُتنا ہی ہولے

تھا ۔ کہیں کوئی سُن نہ لے ۔ اُس کے پیار کا گیت ۔ اس کی محبت کی شکست ، اس کی زندگی کی موت ، لیکن کون اُس وقت ساحر نہ تھا ۔ چہ لئے کس نے بازار میں نہ بیچے تھے کس نے کبھی کی طرح اپنے لئے ہر غم کی بھاری سل نہ باندھی تھی جس کے بوجھ سے سینہ یوں چُور چُور ہو گیا تھا ۔ کس نے غم جاناں کی منزل سے گزر کر غم دوراں کو اپنایا نہ تھا ۔ کون تھا جو زخمی نہ رہ چکا تھا ۔ محزوں نہ رہ چکا تھا ۔ شکستہ دل نہ رہ چکا تھا ......

یکایک سبطے نے آہستہ سے کہا ۔ آہستہ سے ۔ جیسے اپنے الفاظ کو چوم رہا ہو ۔ " وہ ہر روز سٹیشن پر ملنے کے لئے آتی تھی ...... " پھر چپ ہو گیا ۔

سب یادوں میں کھو گئے ۔ کسی نے کچھ نہیں کہا ۔ مگر شائد سینکڑوں ۔ ہزاروں ۔ لاکھوں ۔ کروڑوں آدمی ایک خاموش گویائی کے طلسم سے مجبور ہو کر وہاں بیان کر رہے تھے ۔ اپنا نوحہ ۔ اپنی حسرتیں ۔ اپنی آرزوئیں ۔ اپنی مسرتیں

جو وہ تھے، جو وہ بننا چاہتے تھے، سپنے جو ادھورے رہ گئے۔ خوبصورتی، جیسے ہونٹ چوم نہ سکے۔ کسی گم شدہ ماضی کی حسرت۔ کسی نامعلوم مستقبل کی آرزو۔ اور پھر کشمکشِ حیات کا لہکتا ہوا شعلہ، تھا، اب نہیں ہے۔ اب ہوگا۔ ضرور ہوگا...... ضرور......

سب یادوں میں کھو گئے۔ اور پھر آنکھیں بند کر کے سپنے دیکھنے لگے۔

منزل

یکا یک کرشن چندر کی آنکھ کھلی۔ گاڑی ایک چھوٹے
سے سٹیشن پر کھڑی تھی۔ جگر صاحب بستر لپیٹ رہے تھے
اور سٹیشن پر جانے والے تھے۔ بستر لپیٹ کر انہوں نے
سوئے ہوئے ادیبوں کی طرف دیکھا۔ اور یکا یک کرشن چندر
پر ان کی نظر پڑ گئی۔ اور جگر نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر
لیا۔ کرشن چندر نے دیکھا کہ جگر رو رہے ہیں۔

جگر!

جگر نے منہ موڑتے ہوئے کہا - چھوٹی بہن مرگئی۔
کسی نے کرشن چندر کا دل پکڑ لیا۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔
میری چھوٹی بہن مرگئی ہے - اب میں اُسے گاؤں سے لانے جا رہا ہوں۔ میں نے اس کے علاج کے لئے دو سو روپے بچائے ہیں۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اور اس کے لہجے میں نیم دیوانگی تھی۔

وہ چپ چاپ سٹیشن پر اتر گیا۔ پلیٹ فارم پر اس کے عزیز کھڑے تھے۔ یکایک اک سنہری وردی میں ملبوس اردلی وہاں سے گزرا۔ اُس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ اور وہ سر سلطان احمد کے سپیشل سیلون کی طرف جا رہا تھا۔ جگر نے جلدی میں اُس سے ٹھوکر کھائی اور تھوڑا سا دودھ چھلک کر باہر گر گیا۔

دیکھ کر نہیں چلتے ہیں آپ ؟ اردلی نے چنگھاڑ کر کہا
گارڈ نے سیٹی دی۔
جگر نے آنسو پونچھ کر کہا - "خدا حافظ"

کرشن چندر اُسے خدا حافظ نہ کہہ سکا۔ گاڑی چلنے لگی

ساحر لدھیانوی کرشن چندر کے قریب سیٹ پر لیٹے تھے۔ کرشن چندر نے آہستہ سے کہا ساحر..... ساحر نے اُسی طرح لیٹے لیٹے کہا۔ میں خوب جانتا ہوں اس شخص کو۔ یہ ابراہیم جلیس کا بھائی ہے۔

کرشن چندر نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ تم جانتے ہو اس کی چھوٹی بہن مر گئی ہے۔

ہاں میں سن رہا تھا۔ ساحر نے نیچے تکیے میں جو ہر قسم کے جذبات سے عاری معلوم ہوتا تھا کہا۔ میں جانتا ہوں۔ اُس کی بہن مر گئی ہے۔ اُس کی ایک ہی بہن تھی ہمارے گھر میں آئے وہی سب سے پیاری تھی۔ لیکن وہ اتنی محبت کے باوجود وہ اُس کا علاج اب تک حیدرآباد میں نہ کرا سکا۔ کیونکہ اب تک وہ دو سو روپے اکٹھے نہ

نہ کر سکا تھا۔

مگر۔ کرشن چندر کہنا چاہا۔ لیکن ساحر نے اسے بولنے نہیں دیا۔

اور جب اُس نے دو سو روپے اکٹھے کر لئے۔ تو یہ کانفرنس آ گئی۔ اور اُس نے یہ روپے کانفرنس کے لئے دید یئے۔ اور اُس نے گاؤں گاؤں گھوم کر مخدوم کے ساتھ ہر جگہ جا کر چندہ اکٹھا کیا۔ کسانوں سے۔ مزدوروں سے۔ طلبا سے، غریب لوگوں سے چندہ جمع کیا۔ تاکہ کلچر زندہ رہے اُس کی بہن مرجائے لیکن تہذیب زندہ رہے۔ تمدن زندہ رہے۔ فن کار کا خیال زندہ رہے۔ اُس کی بہن اچھی خوراک اور مناسب دوا نہ ملنے سے سسک سسک کر جان دیدی لیکن کتاب زندہ رہے۔ زبان زندہ رہے، قوم کی روح زندہ رہے۔ اُس کی پیاری پیاری، املی کھانے والی، امرود توڑ توڑ کر چرا کر کھانے والی، اُس کے بچپن کی ساتھی بہن مرجائے لیکن کالیداس زندہ رہے۔ غالب زندہ

رہے۔ اقبال زندہ رہے۔ پریم چند زندہ رہے۔ موت اُس کی بہن کے ہونٹوں کو یخ بستہ کر دے اور اُس کی آنکھوں کو بے نور کر دے۔ لیکن زندگی اور اُس کا زندہ ادب اپنے نور سے اور اپنی حرارت سے اور اپنے ایمان سے لاکھوں دلوں کو روشن کر دے۔

مگر۔۔۔۔ کرشن نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ساحر اب بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ بہت سے ادیب جاگ اٹھے تھے۔

کانفرنس کامیاب رہی، مگر اُس کی بہن مر گئی کانفرنس کے دوران میں جگر کو اپنی بہن کی شدید علالت کے تین تار آئے۔ لیکن وہ اُسے لانے نہیں گیا۔ چپ چاپ کانفرنس کا کام کرتا رہا۔ جب پہلا تار آیا اُس روز تم اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے۔ جب دوسرا تار آیا۔ اُس روز تم پریم چند سوسائٹی کے مہمان ہو کر ڈنر کھا رہے تھے۔ جب تیسرا تار پہنچا۔ تم لوگ راجہ مہاراج کے ہاں مدعو تھے۔۔۔

ساحر کرشن چندر زور سے چلایا۔ جیسے کسی نے

اُس کے دل میں آہنی کیل گاڑ دی ہو۔ اور پھر جیسے اس
کیل سے لہو کی سُرخ دھار پھوٹ نکلی۔ کسی نے اپنی جان
سے پیاری ہمشیرہ کی زندگی کا لہو دے کر ادب کو زندہ کر دیا
تھا۔ لہو چاروں طرف بہہ رہا تھا۔ اور اس میں طلائی صراحیاں
اور اخروٹ کے میز اور نقرئی پلنگ ڈوب رہے تھے۔
حریری پردے سرک گئے تھے۔ اور دیوار ٹوٹ گئی تھی۔
جس نے انسان اور انسان کے مابین امتیاز پیدا کر دیا تھا۔
چاروں مینار سرنگوں تھے۔ اور تیز دوڑتی ہوئی سیاہ
سیڈان سیاہ فام گھاٹوں کے آگے سر بسجود تھی، وہ لوگ
اکیلے تھے۔ کمینے تھے۔ احساس کمتری اور خود غرضی کے
شکار تھے۔ لیکن سب مل کے وہ جیسے کچھ اور ہو گئے تھے
کسی نئی ہمت۔ کسی نئی قوت، کسی نئی عظمت سے سرشار
ہو گئے تھے۔ جیسے مل کے اُن کی برائیاں دب گئی تھیں
اور اچھائیاں اُبھر آئی تھیں۔ ساحراب چپ تھا۔ لیکن
اس کا سینہ کسی انجانے طوفان سے رستا خیز تھا۔ اس نے

کنکھیوں سے اپنے رفیقوں کی طرف دیکھا۔ کوئی ایسا نہ تھا۔ جس کی آنکھیں پُر نم نہ ہوں۔ پُر نم اور دُور ـــــ بہت دُور جیسے وہ ماضی اور حال اور مستقبل کے پرے جاکر بھی کچھ تلاش کر رہی ہوں۔ کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔ کچھ پا رہی ہوں....
وآمق آہستہ سے گانے لگا۔

پورب دیس میں ڈگی باجے بھوکا ہے بنگال رے ساتھی۔
بھوکا ہے بنگال
رے ساتھی

یہ بھوکے بنگال کا گیت تھا۔ اداس دلوں کا گیت تھا۔ مرتی ہوئی روحوں کا گیت تھا۔ لیکن اس وقت نہ جانے اس گیت میں کون سی طاقت آگئی تھی۔ کہ یہ گیت موت کا گیت نہیں زندگی کا نغمہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی لے میں اداسی کی جھلک نہیں اک کامراں تبسم کی ضو نگن معلوم

ہوتی تھی۔ اس کی پہنائی میں یاس وحسرت نہیں اک پُرامید
للکار کی گونج سنائی دیتی تھی۔ جیسے اس گیت کا سویا سویا
مدھم نوحہ کسی کے خون سے جاگ اٹھا تھا۔ اور اک بے خطر
بغاوتی طوفانی انداز میں کہہ رہا تھا۔

پورب دیس میں ڈگی باجے

ڈگ ..... ڈگ ..... ڈگ ..... ڈگی باج رہی
تھی۔ پورب دیس ہی میں نہیں۔ پورب۔ اُتر۔ دکھن۔ پچھم۔
ہندوستان کی چاروں کھونٹوں میں یہ ڈگی باج رہی تھی۔
ہندوستان کا وہ کون سا گوشہ ہے جو بنگال نہیں!
وامق کے گاتے گاتے یکایک وہ سب ایکدم اکٹھے
پوری قوت سے گانے لگے۔

پورب دیس میں ڈگی باجے بھوکا ہے بنگال رے ساتھی۔

بھوکا ہے بنگال

رے ساتھی!

ساتھی۔ یہ ڈگی سن لے۔ یہ خطرے کی ڈگی۔ اک عبر
تم للکار۔ اک پیہم پے کار۔

آؤ۔ آؤ۔ ساتھی

ساتھی جو بھوکے تھے، ساتھی جو مدقوق تھے، ساتھی
جو جیل کی عقوبتوں کے آثار لئے ہوئے تھے، ساتھی جو
ٹھٹھری ہوئی ناکام آرزوؤں کے مزار تھے۔ ساتھی جو درد
کی تفسیر تھے اب یکایک اٹھ کر اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے
اور اپنی روح کی پوری قوت سے گانے لگے۔ خود ہی
گا رہے تھے۔ اور خود ہی سن رہے تھے۔ اک نیا
گیت۔ اک نیا خیال، اک نئی آواز، اک نیا تبسم۔ جیسے
ادھ کھلی کلی یکایک کچھ سوچ کے مسکرا اٹھے...

باہر گاڑی بھاگی جا رہی تھی۔ لیکن اندر سکون تھا
باہر چاروں طرف اندھیرا تھا۔ لیکن گاڑی کے اندر روشنی
تھی۔ باہر راستہ تاریک اور دشوار گزار تھا۔ لیکن اند
منزل معلوم ہو چکی تھی۔